انتخاب

اکبر الہ آبادی

جیبی کتابیں، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

انتخاب اکبر الہ آبادی

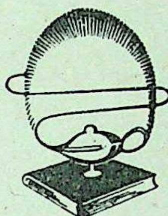
تصحیح و ترتیب

(ڈاکٹر) صدیق الرحمٰن قدوائی

جیبی کتابیں جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

Danish Mahal
Book Sellers
Aminuddaula Park
LUCKNOW-18

سلسلۂ مطبوعات جیبی کتابیں ۔ 9



تقسیم کار

صدر دفتر:

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی 110025

شاخیں:

۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی 110006

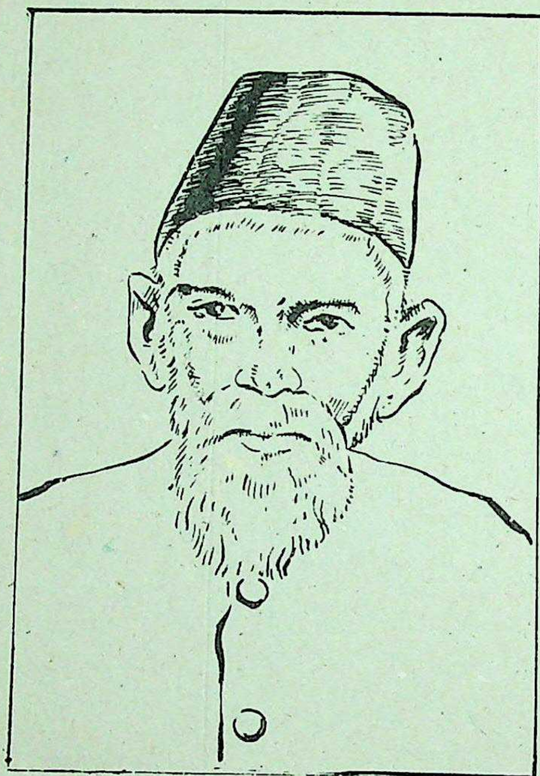
۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار اگست ۸۴ء   تعداد 2000   قیمت =/8

9. INTEKHAB-E-AKBAR ALLAHABADI (POEMS) RS.8/-
Edited by S.R.Kidwai

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دلی میں طبع ہوئی



اکبر الٰہ آبادی

تعارف

سید اکبر حسین اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بہ مقام بارہ (الہ آباد) پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے تو ابتدائی تعلیم مشرقی انداز کی ہی دلوائی تھی مگر خود انھوں نے ذاتی لیاقت اور دلچسپی کی بنا پر انگریزی سے بھی اچھی واقفیت حاصل کر لی۔ شروع میں چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ پھر عدالت سے وابستہ ہوئے، وکالت کا امتحان دیا اور سشن جج کے عہدے تک ترقی کی۔ ہائی کورٹ کی ججی کا بھی موقع آیا مگر خرابیِ صحت کی وجہ سے پہلے ہی ریٹائر ہو گئے۔ اس دور کے شرفا کی طرح اُن کی جوانی بھی خاصی رنگین تھی اور شاعری میں بھی اس کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے لے کر پہلی جنگِ عظیم کے آغاز و اختتام اور تحریکات خلافت و عدم تعاون تک، سب کچھ نہ صرف دیکھا بلکہ ذہنی و فکری طور پر اُن میں دلچسپی بھی لی۔ عدالتوں سے وابستگی کی بدولت انگریز حکام اور اُن کے گرد گھومنے والے طبقے کی زندگی اور کرداروں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اُن کے کلام میں ان سب تجربات و مشاہدات کے بہت واضح اثرات ملتے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں مغربی تہذیب، سامراجی سازش کا ایک روپ بن کر سامنے آئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے نقلی انگریزیت کا طرح طرح سے مذاق اُڑایا۔ اکبر کا انتقال ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔

اکبر اس وقت تک اردو میں طنز و مزاح کے سب سے بڑے نمایندے ہیں اُن سے قبل اردو شاعری میں یہ عناصر عموماً غزلوں کے اشعار میں بکھرے ہوئے تھے جن کا نشانہ زیادہ تر واعظ، محتسب، رقیب یا خود عاشق و معشوق ہوا کرتے تھے۔ مگر یہاں طنز و مزاح محض شاعر کے اندازِ بیان کے ایک پینترے یا اس کے تخیل کی بس ایک کروٹ سے زیادہ حیثیت

نہیں رکھتا تھا۔ ہجو طنز و مزاح کے لیے وقف تھی مگر یہ صنف بنیادی طور پر شاعر کے ذاتی اختلافات کا یا اس کے بغض و عناد کا ایک پشتارہ تھی۔ چنانچہ بڑے سے بڑے شاعر کی لکھی ہوئی ہجویات بھی بد مذاقی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اکبر کے ہاں ہمیں پہلی بار طنز اور مزاح دونوں شاعر کی ذات کی تنگ اور محدود دُنیا سے بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے ہاں یہ محض ایک اندازِ بیان ہی نہیں۔ وہ اسے سماجی تبدیلیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا سب سے اچھا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اُن کی شاعری میں محض ہنسوڑپن اور مضحکہ نہیں بلکہ سنجیدگی، شائستگی اور تفکّر کی فضا چھائی ہوئی ملتی ہے۔

اکبر کے نزدیک شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید و اصلاح تھا۔ دراصل ۱۸۵۷ء کے بعد سے ملک کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نقطۂ نظر کو ہر شعبے پر منطبق کر کے قومی زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چنانچہ شعر و ادب کو بھی سماجی اصلاح کا ذریعہ بنایا گیا۔ سرسید تحریک کے علم برداروں نے اور اکبر نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق شاعری کے ذریعے قومی اصلاح کی کوشش کی۔ سماجی اعتبار سے متضاد نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود سرسید، حالی اور اکبر یکساں ادبی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔

اکبر اپنے دور کی زندگی اور اس کے مسائل کو ایک کارٹونسٹ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی نگاہ ہمیشہ مغربی اثرات کے تحت پلنے والی جدید اقدار کے مضحک پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ اپنے تخیل کی بدولت اور زبان کی مدد سے وہ ان پہلوؤں کو اور زیادہ مضحک بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ایک کارٹونسٹ اپنے اسکیچ میں بعض خطوط کو گھٹا بڑھا کر اُن پہلوؤں کو نمایاں کر دیتا ہے جن پر طنز کرنا مقصود ہو، اسی طرح اکبر بھی نئی تہذیب کی خامیوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اُجاگر کرتے ہیں۔ مبالغہ جو سلیقے اور تناسب کے ساتھ ہو، اس فن کی جان ہے۔ یہ مبالغہ اس اعتبار سے حقیقت آمیز ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے زندگی،

شخصیت، یا کسی شے کے مختلف خارجی یا داخلی عناصر کے اس عدم تناسب کو سب کی نظروں میں عیاں کیا جاسکتا ہے جو پیچیدگیوں میں اس قدر لپٹا ہوا ہوتا ہے کہ لوگوں کو محسوس تو ہوتا ہے مگر کوئی شخص اس کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینے پر مائل نہیں ہوتا۔ اکبرؔ کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے باوجود کہ اُن کے خیالات سے آج اتفاق نہیں کیا جاتا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شاید اتنا بھی اتفاق نہ رہے جتنا آج ہے ، مغربیت کی جن خامیوں کا انھوں نے مذاق اُڑایا ہے، خصوصاً مغرب کی اندھی پیروی اور ظاہر پرستی پر جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس سے اختلاف ممکن نہیں۔ اکبرؔ اپنے اشعار کے آئینے میں ہمیں ہماری ایسی شکل دکھاتے ہیں کہ ہم خود اپنی حالت پر بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں۔ اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں، خواہ اکبرؔ کی بات مانیں یا نہ مانیں۔

اکبرؔ وقت کی رفتار کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ تغیّرات کا یہ طوفان کسی کے روکے رُک نہیں سکتا۔ چنانچہ بسا اوقات وہ خود اپنی باتوں پر ہنستے ہوئے ملتے ہیں گو کہ اس ہنسی میں درد کی ایک لہر بھی ہوتی ہے :

تاکیدِ عبادت پہ یہ سب کہتے ہیں لڑکے   پیری میں بھی اکبرؔ کی ظرافت نہیں جاتی

اکبرؔ کو زبان پر بلا کی قدرت تھی۔ انھوں نے عام بول چال کی زبان اور انگریزی کے رائج الفاظ کا اس قدر برجستہ استعمال کیا اور اُن کے ذریعے اس خوبی سے مزاح کا کام لیا کہ اُن سے پہلے شاید کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ ایک بڑے طنز نگار یا مزاح نگار کی ایک لازمی صفت یہ ہے کہ اُسے اپنے میڈیم (Medium) یا وسیلۂ اظہار پر اتنا قابو ہو کہ وہ اُس کے ان دیکھے پہلوؤں کی طرف پڑھنے والے کے ذہن کو متوجہ کر کے ایک انوکھا تاثر پیدا کر سکے۔ اکبرؔ کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ یہ صفت اُن کے اندر کس حد تک موجود تھی۔ اکبرؔ کے ہاں انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال خصوصاً قابلِ توجہ ہے۔ انھوں نے اس کے ذریعے

انگریز پرست ہندستانیوں پر دلچسپ اور برمحل چوٹیں کی ہیں۔

اکبر نے ابتدا میں روایتی انداز کی غزلیں بھی بہت کہی ہیں جن کے بعض اشعار آج تک زبان زد ہیں اور لوگوں کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ اشعار اکبر جیسے شاعر کے ہوں گے۔ یہ غزلیں اکبر کی جوانی کی یادگار ہیں۔ یہ فنی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہیں اور ان سے اکبر کی شخصیت و مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

کلیاتِ اکبر کی تین جلدیں اُن کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ پھر اُس کے اور اڈیشن بھی شائع ہوتے رہے۔ چوتھی جلد پہلی بار ۱۹۴۸ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی جس کے وجود کا علم لوگوں کو عموماً نہیں ہے۔ مجھے اس کا پتہ اپنے محترم بزرگ مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کے ایک ریڈیائی تبصرے سے چلا اور اُن ہی کی نوازش سے مجھے اُن کے ذاتی نسخے سے استفادے کا موقع بھی ملا۔ اس نسخے میں مولانا صاحب نے جا بجا تصحیح فرمائی ہے، حاشیے لکھے ہیں، اور ایسے نشانات بھی لگائے ہیں جن سے اُن کی پسند و ناپسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ اِن اشارات نے میری بڑی رہنمائی کی ہے۔ میں مولانا صاحب کی عنایت کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔ اکبر کا "گاندھی نامہ" پہلی بار کتابستان، الہ آباد نے ۱۹۴۸ء میں ہی شائع کیا تھا۔ انتخاب کے وقت یہ کتاب بھی میرے پیشِ نظر رہی ہے۔

اس انتخاب سے اگر ایک طرف اکبر کی صحیح نمایندگی مقصود ہے تو دوسری طرف یہ غرض بھی ہے کہ آج کے پڑھنے والوں کو یہاں وہ سب کچھ مل جائے جس کے وہ کلامِ اکبر میں متلاشی ہوں گے۔ چنانچہ اس انتخاب میں کوشش یہی کی گئی ہے کہ اکبر کی پوری اور سچی تصویر پیش کر دی جائے۔

جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

۵ نومبر ۱۹۷۰ء

صدیق الرحمٰن قدوائی

غزلیات

کیا ہی رہ رہ کے طبیعت مری گھبراتی ہے
موت آتی ہے شبِ ہجر، نہ نیند آتی ہے

وہ بھی چپ بیٹھے ہیں، اغیار بھی چپ، میں بھی خموش
ایسی صحبت سے طبیعت مری گھبراتی ہے

کیوں نہ ہو اپنی لگاوٹ کی نظر پر نازاں
جانتے ہو کہ دلوں کو یہ لگا لاتی ہے

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں
کوئی گذری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا
آنکھ اُن سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں، آئیں تو احسان ہے اُن کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سو جان سے محوِ رُخِ جاناں ہیں تو ہم ہیں — اس آئینہ خانہ میں جو حیراں ہیں تو ہم ہیں
گلگشت کریں پھول چنیں اُن کو ہے کیا غم — آوارۂ صحرائے مغیلاں ہیں تو ہم ہیں
بھڑکی ہوئی ہے آتشِ گل اپنے ہی دم سے — سوزِ جگرِ بلبلِ نالاں ہیں تو ہم ہیں
شور اپنے ہی جلوے کا ہے یہ دیر و حرم میں — مقصودِ دلِ گبر و مسلماں ہیں تو ہم ہیں
اے برق تڑپنے میں ہمیں ہیں ترے ساتھی — اے ابر ترے ساتھ جو گریاں ہیں تو ہم ہیں

دن رات رقیبوں پہ ہے صاحب کی عنایت
بس ایک غمِ ہجر میں نالاں ہیں تو ہم ہیں

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے، اللہ کا بندا نہ ملا
بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس — ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے — کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم — رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سیّد اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبر
مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

جو تمہارے لبِ جاں بخش کا شیدا ہوگا — اُٹھ بھی جائے گا جہاں سے تو مسیحا ہوگا
وہ تو موسیٰ ہوا جو طالبِ دیدار ہوا — پھر وہ کیا ہوگا کہ جس نے تمہیں دیکھا ہوگا
قیس کا ذکر مرے شانِ جنوں کے آگے! — اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا
آرزو ہے مجھے اک شخص سے ملنے کی بہت — نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندا ہوگا

لعلِ لب کا ترے بوسہ تو میں لیتا ہوں مگر
ڈر یہ ہے خونِ جگر بعد میں پینا ہوگا

مہربانی ہے عیادت کو جو آتے ہیں مگر
کس طرح ان سے ہمارا حال دیکھا جائے گا

دفترِ دُنیا اُلٹ جائے گا بالکل یک قلم
ذرہ ذرہ سب کا اصلی حال دیکھا جائے گا

آفیشل اعمال نامہ کی نہ ہوگی کچھ سند
حشر میں تو نامۂ اعمال دیکھا جائے گا

بچ رہے طاعون سے تو اہلِ غفلت بول اُٹھے
اب تو مہلت ہے پھر اگلے سال دیکھا جائے گا

تہ کرو صاحب نسب نامے، وہ وقت آیا ہے اب
بے اثر ہوگی شرافت، مال دیکھا جائے گا

رکھ قدم ثابت، نہ چھوڑ اکبر صراطِ مستقیم
خیر چل جانے دے اُن کی چال، دیکھا جائے گا

وہ مطرب اور وہ ساز وہ گانا بدل گیا
نیندیں بدل گئیں وہ فسانہ بدل گیا

رنگِ رُخِ بہار کی زینت ہوئی نئی
گلشن میں بلبلوں کا ترانہ بدل گیا

فطرت کے ہر اثر میں ہوا ایک انقلاب
پانی فلک پہ کھیت میں دانہ بدل گیا

حدِ شہرِ عافیت کی نئی طرز پر بندھی
وہ چوکیاں بدل گئیں، تھانہ بدل گیا

کیا جانیے سیّد تھے حق آگاہ کہاں تک
سمجھے نہ کہ سیدھی ہے مری راہ کہاں تک

منطق بھی تو اک چیز ہے اے قبلہ و کعبہ
دے سکتی ہے کام آپ کی واللہ کہاں تک

افلاک تو اس عہد میں ثابت ہوئے معدوم
اب کیا کہوں جاتی ہے مری آہ کہاں تک

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورمنٹ سے تنخواہ کہاں تک

اے حرص کے بندو! ہوسِ جاہ کہاں تک
مرنا بھی ضروری ہے خدا بھی ہے کوئی چیز
تحسین کے لائق ترا ہر شعر ہے اکبر
احباب کریں بزم میں اب واہ کہاں تک

دلِ مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
اُمیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں
مری بیتابیاں بھی جزو ہیں اک میری ہستی کی
یہ ظاہر ہے کہ موجیں خارج از دریا نہیں ہوتیں
وہی پریاں ہیں اب بھی راجا اندر کے اکھاڑے میں
مگر شہزادۂ گلفام پر شیدا نہیں ہوتیں
یہاں کی عورتوں کو علم کی پروا نہیں بے شک
مگر یہ شوہروں سے اپنے بے پروا نہیں ہوتیں
تعلق دل کا کیا باقی میں رکھوں بزمِ دنیا سے
وہ دلکش صورتیں اب انجمن آرا نہیں ہوتیں
ہوا ہوں اس قدر افسردہ رنگِ باغِ ہستی سے
ہوائیں فصلِ گل کی بھی نشاط افزا نہیں ہوتیں
قضا کے سامنے بیکار ہوتے ہیں حواس اکبر
کھلی ہوتی ہیں گو آنکھیں مگر بینا نہیں ہوتیں

بحثیں فضول تھیں یہ کھلا حال دیر میں
افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں
ہے ملک ادھر تو قحط زدہ اُس طرف یہ وعظ
کشتے وہ کھا کے پیٹ بھرے پان سیر میں
ہیں غش میں شیخ دیکھ کے حُسنِ مِس فرنگ
بچ بھی گئے تو ہوش انھیں آئے گا دیر میں
چھوٹا اگر میں گردشِ تسبیح سے تو کیا
اب پڑ گیا ہوں آپ کی باتوں کے پھیر میں

وزن اب ان کا معیّن نہیں ہو سکتا کچھ
برف کی طرح مسلمان گُھلے جاتے ہیں
داغ اب ان کی نظر میں ہیں شرافت کے نشاں
نئی تہذیب کی موجوں سے دُھلے جاتے ہیں

علم نے رسم نے مذہب نے جو کی تھی بندش ٹوٹی جاتی ہے وہ سب بند کھلے جاتے ہیں
شیخ کو وجد میں لائی ہیں پیانو کی گتیں
پیچ دستارِ فضیلت کے کھلے جاتے ہیں

بہت رہا ہے کبھی لطفِ یار ہم پر بھی گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی
عروسِ دہر کو آیا تھا پیار ہم پر بھی یہ بیسوا تھی کسی شب نثار ہم پر بھی
بٹھا چکا ہے زمانہ ہمیں بھی مسند پر ہوا کیے ہیں جواہر نثار ہم پر بھی
عدو کو بھی جو بنایا ہے تم نے محرمِ راز تو فخر کیا جو ہوا اعتبار ہم پر بھی
خطا کسی کی ہو لیکن کھلی جو اُن کی زباں تو ہو ہی جاتے ہیں دو ایک وار ہم پر بھی
ہم ایسے رند مگر یہ زمانہ ہے وہ غضب کہ ڈال ہی دیا دُنیا کا بار ہم پر بھی
ہمیں بھی آتشِ الفت جلا چکی اکبر
حرام ہو گئی دوزخ کی نار ہم پر بھی

کر دیا نزع نے واقف کہ یہ ہستی کیا تھی ہوش آیا تو کھلا حال کہ مستی کیا تھی
رنگِ حافظ پہ بہک جاتے ہیں اربابِ مجاز یہ سمجھتے نہیں وہ بادہ پرستی کیا تھی
فرقتِ یار میں بدلی کا مزہ کچھ نہ ملا میری نظروں میں تو روتی تھی برستی کیا تھی
میں تو بت خانہ میں گاہک نہ ہوا عزت کا
دین کے بدلے میں ملتی تھی تو سستی کیا تھی

معنی کو بھلا دیتی ہے صورت ہے تو یہ ہے نیچر بھی سبق سیکھ لے زینت ہے تو یہ ہے
کمرے میں جو ہنستی ہوئی آئی مسِ رعنا نیچر نے کہا علم کی آفت ہے تو یہ ہے

یہ بات تو اچھّی ہے کہ اُلفت ہو مسوں سے
حُور اُن کو سمجھتے ہیں، قیامت ہے تو یہ ہے
پیچیدہ مسائل کے لیے جاتے ہیں انگلینڈ
زلفوں میں اُلجھ آتے ہیں شامت ہے تو یہ ہے
پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجیے مجھ سے
صاحب مرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دَورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
نہ پیدا ہو گی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیبِ رقم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل، زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پُتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہو گی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے
کسی کو اس تغیّر کا نہ حس ہو گا نہ غم ہو گا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

وہ ہوا نہ رہی، وہ چمن نہ رہا، وہ گلی نہ رہی، وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا، وہ سماں نہ رہا، وہ مکاں نہ رہے، وہ مکیں نہ رہے

وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی، وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی
وہ حسینوں میں رنگِ وفا نہ رہا، کہیں اور کی کیا، وہ ہمیں نہ رہے

نہ وہ آن رہی، نہ اُمنگ رہی، نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی
سوئے قبلہ نگاہوں کے رُخ نہ رہے، درِ دَیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے

نہ وہ جام رہے، نہ وہ مست رہے، نہ فدائی عہدِ الست رہے
وہ طریقۂ کارِ جہاں نہ رہا، وہ مشاغلِ رونقِ دیں نہ رہے

ہمیں لاکھ زمانہ لبھائے تو کیا، نئے رنگ جو چرخ دکھائے تو کیا
یہ محال ہے اہلِ وفا کے لئے، غمِ ملّت و الفتِ دیں نہ رہے

ترے کوچۂ زلف میں دل ہے مرا، اب اسے میں سمجھتا ہوں دامِ بلا
یہ عجیب ستم ہے، عجیب جفا، کہ یہاں نہ رہے تو کہیں نہ رہے

یہ تمھارے ہی دم سے ہے بزمِ طرب، ابھی جاؤ نہ تم، نہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا، کہ جو رونقِ بزم تمھیں نہ رہے

جو تھیں چشمِ فلک کی بھی نورِ نظر، وہی جن پہ نثار تھے شمس و قمر
سو اب ایسی مٹی ہیں وہ انجمنیں، کہ نشاں بھی ان کے کہیں نہ رہے

وہی صورتیں رہ گئیں پیشِ نظر، جو زمانہ کو پھیریں ادھر سے اُدھر
مگر ایسے جمالِ جہاں آرا، جو تھے رونقِ روئے زمیں نہ رہے

غم و رنج میں اکبرؔ اگر ہے گھرا، تو سمجھ لے کہ رنج کو بھی ہے فنا
کسی شے کو نہیں ہے جہاں میں بقا، وہ زیادہ ملول و حزیں نہ رہے

بے نالہ و فریاد و فغاں رہ نہیں سکتے
قہر اس پہ یہ ہے اس کا سبب کہہ نہیں سکتے
موجیں ہیں طبیعت میں مگر اُٹھ نہیں سکتیں
دریا ہیں مرے دل میں، مگر بہہ نہیں سکتے
پتوار شکستہ ہے نہیں طاقتِ ترمیم
ہے ناو میں سوراخ مگر کہہ نہیں سکتے
کہہ دوگے کہ ہے تجربہ اس بات کے برعکس
کیوں کر یہ کہیں ظلم و ستم سہہ نہیں سکتے
عزت کبھی وہ تھی کہ بھُلائے سے نہ بھولے
تحقیر اب ایسی ہے جسے سہہ نہیں سکتے

شیخ جی اپنی سی بکتے ہی رہے
وہ تھی ایٹر[ل] میں تھرکتے ہی رہے
دف بجایا ہی کیے مضموں نگار
وہ کمیٹی میں مٹکتے ہی رہے
سرکشوں نے طاعتِ حق چھوڑ دی
اہلِ سجدہ سر پٹکتے ہی رہے
جو غبارے تھے وہ آخر گر گئے
جو ستارے تھے چمکتے ہی رہے

آنکھیں مجھے تلووں سے وہ ملنے نہیں دیتے
ارمان مرے دل کا نکلنے نہیں دیتے
خاطر سے تری یاد کو ٹلنے نہیں دیتے
سچ ہے کہ ہمیں دل کو سنبھلنے نہیں دیتے
کس ناز سے کہتے ہیں وہ جھنجلا کے شبِ وصل
تم تو ہمیں کروٹ بھی بدلنے نہیں دیتے
پروانوں نے فانوس کو دیکھا تو یہ بولے
کیوں ہم کو جلاتے ہو کہ جلنے نہیں دیتے
حیران ہوں کس طرح کروں عرضِ تمنا
دشمن کو تو پہلو سے وہ ٹلنے نہیں دیتے
دل وہ ہے کہ فریاد سے لبریز ہے ہر وقت
ہم وہ ہیں کہ کچھ منہ سے نکلنے نہیں دیتے

[ل] theatre

گرمیِ محبت میں وہ ہیں آہ سے مانع
پنکھا نفسِ سرد کا جھلنے نہیں دیتے

ہوائے شب بھی ہے عنبر افشاں، عروج بھی ہے مہِ مبیں کا
نثار ہونے کی دو اجازت محل نہیں ہے "نہیں نہیں" کا
اگر ہو ذوقِ سجود پیدا، ستارہ ہو اوج پر جبیں کا
نشانِ سجدہ زمین پر ہو تو فخر ہے وہ رُخِ زمیں کا
صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا یہ کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے، پیام لائی نہ ہو کہیں کا
نہ مہر و مہ پر مری نظر ہے، نہ لالہ و گل کی کچھ خبر ہے
فروغِ دل کے لیے ہے کافی تصوّر اس روئے آتشیں کا
نہ علمِ فطرت میں تم ہو ماہر، نہ ذوقِ طاعت ہے تم سے ظاہر
یہ بے اصولی بہت بُری ہے تمھیں نہ رکھے گی یہ کہیں کا

نہ رُوحِ مذہب، نہ قلبِ عارف، نہ شاعرانہ زبان باقی
زمیں ہماری بدل گئی ہے، اگرچہ ہے آسمان باقی
شبِ گزشتہ کے ساز و ساماں کے اب کہاں ہیں نشان باقی
زبانِ شمعِ سحر پہ حسرت کی رہ گئی داستان باقی
جو ذکر آتا ہے آخرت کا تو آپ ہوتے ہیں صاف منکر
خدا کی نسبت بھی دیکھتا ہوں، یقین رخصت، گمان باقی
فضول ہے ان کی بد دماغی کہاں ہے فریاد اب لبوں پر

یہ وارپر دار اب عبث ہیں کہاں بدن میں ہے جان باقی
میں اپنے مٹنے کے غم میں نالاں ادھر زمانہ ہے شاد وخنداں
اشارہ کرتی ہے چشمِ دوراں جو آن باقی جہان باقی
اسی لیے رہ گئی ہیں آنکھیں کہ میرے مٹنے کا رنگ دیکھیں
سنوں وہ باتیں جو ہوش اُڑائیں اسی لیے ہیں یہ کان باقی
تعجب آتا ہے طفلِ دل پر کہ ہو گیا مستِ نظمِ اکبرؔ
ابھی مڈل پاس تک نہیں ہے بہت سے ہیں امتحان باقی

ترے سحرِ نظر سے ہوا یہ جنوں، مرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی
ترے کوچے میں آکے میں بیٹھ رہا بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی
ہوئی طبع جو مائل دامِ بلا۔ میں تمہاری ہی زلفِ سیہ میں پھنسا
مرے دامنِ دل کو جو کھینچ سکے، کوئی اور تو ایسی بلا ہی نہ تھی
کیا صحبتِ غیر نے قہر وغضب، مجھے کوئی امید رہی نہیں اب
دمِ چند کو مجھ سے ملے بھی جو کل، وہ نظر ہی نہ تھی وہ ادا ہی نہ تھی
نہ نبھی تو پھر اس میں تھی کس کی خطا، یہ گلا ہے مری ہی طرف سے بجا
مرے عشق کا رنگ تو خوب رہا، مگر آپ میں بوئے وفا ہی نہ تھی
میں وطن سے حزین وملول پھرا، نہ وہ بزم ملی، نہ وہ یار ملے
گل ولالہ وسرو کا ذکر کجا، وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی
غمِ ہجر میں جی سے گیا جو گزر، تو یہ اکبرؔ زار نے خوب کیا
کہ علاجِ فراق تو تھا ہی یہی، بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

شیخ نے ناقوس کے سُر میں جو خود ہی تان لی
پھر تو یاروں نے بھجن گانے کی کھل کر ٹھان لی

مدّتوں قائم رہیں گی اب دلوں میں گرمیاں
میں نے فوٹو لے لیا اس نے نظر پہچان لی

رو رہے ہیں دوست میری لاش پر بے اختیار
یہ نہیں دریافت کرتے کس نے اس کی جان لی

میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہو گیا
رہ گئے نغمے حُدی خوانوں کے ایسی تان لی

حضرتِ اکبر کے استقلال کا ہوں معترف
تا بہ مرگ اُس پر رہے قائم جو دل میں ٹھان لی

نہ وہ بت کدے کہیں رہ گئے، نہ وہ دلبری کو صنم رہے
نہ وہ دن رہے، نہ وہ ہم رہے، نہ وہ دل رہا، نہ وہ غم رہے

اب انھیں کے کوچہ کی دھوم ہے، نہیں کرتا ذکرِ ارم کوئی
انھیں ضد بھی تھی اسی بات کی کہ نہ ذکرِ باغ ارم رہے

مری رندیوں کا ہے خاتمہ، نہ وہ مستیاں، نہ وہ ولولے
نہ مئے کہن کا رہا نشاں، نہ طریقِ محفلِ جم رہے

مجھے کیا اُمید فروغ کی کہ بتوں کی تو ہے یہی خوشی
نہ یہ دل رہے، نہ زباں رہے، نہ خدا رہے، نہ حرم رہے

کہاں وہ اب لطفِ باہمی ہے، محبتوں میں بہت کمی ہے
چلی ہے کیسی ہوا الٰہی کہ ہر طبیعت میں برہمی ہے

مری وفا میں ہے کیا تزلزل، مری اطاعت میں کیا کمی ہے
یہ کیوں نگاہیں پھری ہیں مجھ سے، مزاج میں کیوں یہ برہمی ہے

وہی ہے فضلِ خدا سے اب تک ترقیِ کارِ حُسن و اُلفت

نہ وہ ہیں مشقِ ستم میں قاصر، نہ خونِ دل کی یہاں کمی ہے
عجیب جلوے ہیں ہوش دشمن کہ وہم کے بھی قدم رُکے ہیں
عجیب منظر ہیں حیرت افزا، نظر جہاں تھی وہیں تھمی ہے
نہ کوئی تکریمِ باہمی ہے، نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں
یہ صرف تحریر میں "ڈیر سر" ہے یا جنابِ مکرّمی ہے
کہاں کے مسلم، کہاں کے ہندو، بھلائی ہیں سب نے اگلی رسمیں
عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ، نہ گیارھویں ہے نہ اشٹمی ہے
نظر مری اور ہی طرف ہے، ہزار رنگِ زمانہ بدلے
ہزار باتیں بنائے ناصح جمی ہے دل میں جو کچھ جمی ہے
اگرچہ میں رندِ محترم ہوں مگر اسے شیخ سے نہ پوچھو
کہ اُن کے آگے تو اس زمانے میں ساری دنیا جہنمی ہے

مہوشوں کی مہربانی ہو چکی ۔۔۔ چار دن کی چاندنی تھی ہو چکی
عاقبت کا اب خیال آنے لگا ۔۔۔ شورشِ عہدِ جوانی ہو چکی
قوم کی مسجد میں کیجے جھاڑ پھونک ۔۔۔ اسپتالوں میں وہ اچھی ہو چکی
آج تم کرتے ہو ذکرِ انحطاط
مدتیں گزریں کہ دہلی ہو چکی

بہرِ عمل کوئی رہ اب اے خدا نہیں ہے ۔۔۔ 'میں' کچھ سند نہیں ہوں 'ہم' کا پتا نہیں ہے
تعلیم و تربیت کا ہے اختلاف ہر جا ۔۔۔ جو کورس ایک کا ہے وہ اور کا نہیں ہے
ہر سر میں ہے یہ سودا "دانم چہ را نگویم" ۔۔۔ وہ کون ہے جو واعظ بن کر اٹھا نہیں ہے

اونچے بہک رہے ہیں، نیچے دبک رہے ہیں
ہے پیٹ ہی کا سودا، دل کا پتا نہیں ہے

جس کو بقا نہیں ہے، وہ دل کشا نہیں ہے
جس کو فنا نہیں ہے، اس کا پتا نہیں ہے

اے وہ کہ بے کسوں کو آتی ہے یاد تیری
میرا بھی کچھ سہارا تیرے سوا نہیں ہے

خیال دوڑا، نگاہ اٹھی، قلم نے لکھا، زبان بولی
مگر وہی دل کی اُلجھنیں ہیں کسی نے اس کی گرہ نہ کھولی
لطافتوں کے، نزاکتوں کے، عجیب مضموں ہیں چمن میں
صبا نے جھٹکا ہے اپنا دامن، مسک گئی ہے کلی کی چولی
خیال شاعر کا ہے نرالا، یہ کہہ گیا ایک کہنے والا
شباب کے ساتھ یوں ہے زندگی کہ جیسے پھاگن کے ساتھ ہولی
کہو یہ رندانِ ایشیا سے کہ بزمِ عشرت کے ٹھاٹھ بدلیں
اڑن کھٹولا ہے اب مسوں کا، گئی پری جان کی وہ ڈولی

خوشی کیا ہو جو میری بات وہ بت مان جاتا ہے
مزا تو بے حد آتا ہے مگر ایمان جاتا ہے

بنوں کونسل میں اسپیکر تو رخصت قرأتِ مصری
کروں کیا ممبری جاتی ہے یا قرآن جاتا ہے

زوالِ جاہ و دولت میں بس اتنی بات اچھی ہے
کہ دنیا میں بخوبی آدمی پہچان جاتا ہے

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قایم فقط ایمان جاتا ہے

تھیٹر رات کو اور دن کو یاروں کی یہ اسپیچیں
دُہائی لاٹ صاحب کی مرا ایمان جاتا ہے

جہاں دل میں یہ آئی کچھ کہوں وہ چل دیا اُٹھ کر
غضب ہے فتنہ ہے ظالم نظر پہچان جاتا ہے

"چناں برد ند صبر از دل" کے قصے یاد آتے ہیں
تڑپ جاتا ہوں یہ سن کر کہ اب ایمان جاتا ہے

یہ عمر کب تک وفا کرے گی، زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے قیامت کی ہیں امیدیں، جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

فلک جو برباد بھی کرے گا، بلند ارادے مرے رہیں گے
جو خاک ہوں گا تو خاک سے بھی سدا بگولا اٹھا کرے گا

خدا کی پاکی پکارتا ہوں، ہوا کرے ناخوشی بتوں کو
مری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر مرا کوئی کیا کرے گا

جہانِ فانی کا حشر ہی کو خیال کر مستقل نتیجہ
یہاں تو پیہم یہی تردد یہی تغیر ہوا کرے گا

اگرچہ ہے درد و غم سے مضطر یہی ہے وردِ زبان اکبر
یہ درد جس نے دیا ہے ہم کو وہی ہماری دوا کرے گا

حالِ دل میں سنا نہیں سکتا — لفظ معنیٰ کو پا نہیں سکتا
عشق نازک مزاج ہے بے حد — عقل کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا
ہوشِ عارف کی ہے یہی پہچان — کہ خودی میں سما نہیں سکتا
پونچھ سکتا ہے ہم نشیں آنسو — داغِ دل کو مٹا نہیں سکتا

مجھ کو حیرت ہے اس کی قدرت پر
علم اس کو گھٹا نہیں سکتا

جلوہ عیاں ہے قدرتِ پروردگار کا — کیا دل کشا یہ سین ہے فصلِ بہار کا
نازاں ہیں جوشِ حسن پہ گلہائے دل فریب — جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم ابھار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب — نقشہ کھنچا ہوا ہے خطِ زلفِ یار کا

سبزہ ہے یا یہ آبِ زمرد کی موج ہے — شبنم ہے یا جواہر یا گوہرِ آبدار کا
مرغانِ باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں — اور ناچ ہو رہا ہے نسیمِ بہار کا
پرواز میں ہیں تیتریاں شاد و چست و مست — زیبِ بدن کیے ہوئے خلعت بہار کا
موجِ ہوا و زمزمۂ عندلیبِ مست — اک سازِ دلنواز ہے مضراب و تار کا
ابرِ تنک نے رونقِ موسم بڑھائی ہے — غازہ بنا ہے روئے عروسِ بہار کا

افسوس اس سماں میں بھی اکبرؔ اداس ہے
سوہانِ روح ہجر ہے اک گل عذار کا

کیا عجب ہو گئے مجھ سے مرے دمساز جدا — دورِ فونو میں گلے سے ہوئی آواز جدا
وجد یاروں کو ہے اس بزم میں حیران ہوں میں — سُر سے آواز جدا راگ سے ہے ساز جدا
آسماں کی نہ یہ چالیں ہیں نہ جادو کے یہ رنگ — سب سے اس نرگسِ فتاں کے ہیں انداز جدا

اُن کی آنکھوں کی لگاوٹ سے حذر اے اکبرؔ
دین سے کرتی ہے دل کو یہی غماز جدا

جہاں میں حال مرا اس قدر زبون ہوا — کہ مجھ کو دیکھ کے بسمل کو بھی سکون ہوا
غریب دل نے بہت آرزوئیں پیدا کیں — مگر نصیب کا لکھا کہ سب کا خون ہوا
وہ اپنے حسن سے واقف میں اپنی عقل سے سیر — انھوں نے ہوش سنبھالا، مجھے جنون ہوا
امیدِ چشمِ مروت کہاں رہی باقی — ذریعہ باتوں کا جب صرف ٹیلیفون ہوا

نگاہ گرم کرسمس میں بھی رہی ہم پر
ہمارے حق میں دسمبر بھی ماہِ جون ہوا

مذہبی جنگ اب ہے دنیا کے لیے
دین بھی کچھ ہو اگر نقلی تو کیا!
نفس ہی کی خواہشوں کا ہے نفاد
رُوح نے مذہب کو ڈگری دی تو کیا!
آز و دولت میں خود واعظ ہیں غرق
دوسروں پہ نکتہ چینی کی تو کیا!
بزمِ ساقی کی کہاں وہ مستیاں
چھپ کے اکبر نے اگر پی بھی تو کیا!

حسن دیکھو بتانِ کاشی کا
چہرہ ہے چاند پورنماشی کا
چشمِ تر دیکھ کر وہ مِس بولی
محکمہ ہے یہ آب پاشی کا
آپ کی متن واہ صلِّ علیٰ
سارا فتنہ ہے اِن حواشی کا
ہوگیا فیل امتحانوں میں
اب ارادہ ہے بدمعاشی کا

تُو منع پر اپنی قایم رہ قدرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی، خودبینی کو زنجیر نہ کر
گو تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے
رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اس پہ درِ تاثیر نہ کر
باطن میں اُبھر کر ضبطِ فغاں، لے اپنی نظر سے کارِ زباں
دل جوش میں لا فریاد نہ کر، تاثیر دکھا تقریر نہ کر
تو خاک میں مل اور آگ میں جل، جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

ہم کیوں یہ مبتلائے بے تابیٔ نظر ہیں
تسکینِ دل کی یارب وہ صورتیں کدھر ہیں
ذرّے جو گل بنے تھے وہ بن گئے بگولے
جو زینتِ چمن تھے وہ خاکِ رہگذر ہیں
دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

ہم نے سُنا بہت کچھ حالِ جہانِ فانی! | افسانہ گو غضب ہیں قصے تو مختصر ہیں
پیدا کیے فلک نے نادیدنی مناظر! | نیچی ہیں اُن کی نظریں جو صاحبِ نظر ہیں
غم خانۂ جہاں میں وقعت ہی کیا ہماری | اک ناشنیدہ اُف ہیں اک آہِ بے اثر ہیں
کیا مشرقی کفن بھی وہ ترک کر سکیں گے | اوضاعِ مغربی میں جو غرق سر بسر ہیں

اکبرؔ کے شعر سُن کر کہتے ہیں اہلِ باطن
اب بھی خدا کے بندے کچھ صاحبِ اثر ہیں

دنیا میں ہوں دُنیا کا طلبگار نہیں ہوں | بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی | ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانۂ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث | سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں
افسردہ ہوں عبرت سے دوا کی نہیں حاجت | غم کا مجھے یہ ضعف ہے بیمار نہیں ہوں
وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے | الجھوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں ہوں
یارب مجھے محفوظ رکھ اُس بُت کے ستم سے | میں اس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں
گو دعویِ تقویٰ نہیں درگاہِ خدا میں | بُت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں

افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبرؔ
کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

یہ اختلافِ صورت، فطرت کی مستیاں ہیں | یہ انکشافِ معنیٰ ذہنوں کی ہستیاں ہیں
دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا | عالم ہیں ان گلوں میں غنچوں کی بستیاں ہیں
ساقی سے بے خبر ہیں مستانِ بزمِ ہستی | یا بے خودی ہے طاری یا خود پرستیاں ہیں
اس منزلِ فنا کو اکبرؔ نے خوب دیکھا | جتنی بلندیاں ہیں نظروں کی پستیاں ہیں

چرخ سے کچھ اُمید تھی ہی نہیں
آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں

چاہتا تھا بہت سی باتوں کو
مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں

جرأتِ عرضِ حال کیا ہوتی
نظرِ لطف اُس نے کی ہی نہیں

اس مصیبت میں دل سے کیا کہتا
کوئی ایسی مثال تھی ہی نہیں

آپ کیا جانیں قدرِ "یا اللہ"
جب مصیبت کوئی پڑی ہی نہیں

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا
میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

پوچھا "اکبر ہے آدمی کیسا؟"
ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

درد تو موجود ہے دل میں، دوا ہو یا نہ ہو
بندگی حالت سے ظاہر ہے، خدا ہو یا نہ ہو

جھومتی ہے شاخِ گل، کھلتے ہیں غنچے دمبدم
با اثر گلشن میں تحریکِ صبا ہو یا نہ ہو

وجد میں لاتے ہیں مجھ کو بلبلوں کے زمزمے
آپ کے نزدیک با معنیٰ صدا ہو یا نہ ہو

کر دیا ہے زندگی نے بزمِ ہستی میں شریک
اس کا کچھ مقصود، کوئی مدّعا ہو یا نہ ہو

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہمنشیں
اس میں ہے اک بات آنر کی، شفا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے، خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے، سزا ہو یا نہ ہو

ممبری سے آپ پر تو وارنش ہو جائے گی
قوم کی حالت میں کچھ اس سے جلا ہو یا نہ ہو

معترض کیوں ہو اگر سمجھے تمھیں صیادِ دل
ایسے گیسو ہوں تو شبہ دام کا ہو یا نہ ہو

اُمید ٹوٹی ہوئی ہے میری جو دل مرا تھا وہ مر چکا ہے
جو زندگانی کو تلخ کر دے، وہ وقت مجھ پر گزر چکا ہے

اگرچہ سینے میں سانس بھی ہے، نہیں طبیعت میں جان باقی
اجل کو ہے دیر، اک نظر کی، فلک تو کام اپنا کر چکا ہے
غریب خانے کی یہ اُداسی، یہ نادرستی، نہیں قدیمی
چہل پہل بھی کبھی یہاں تھی، کبھی یہ گھر بھی سنور چکا ہے
یہ سینہ جس میں یہ داغ ہیں اب، مسرّتوں کا کبھی تھا مخزن
وہ دل جو ارمان سے بھرا تھا، خوشی سے اس میں ٹھہر چکا ہے
غریب اکبرؔ کے گرد کیوں ہیں، جنابِ واعظ سے کوئی کہہ دے
اُسے ڈراتے ہو موت سے کیا، وہ زندگی ہی سے ڈر چکا ہے

صدیوں فلاسفی کی چُناں اور چُنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی
زور آزمائیاں ہوئیں سائنس کی بھی خوب
طاقت بڑھی کسی کی، کسی میں نہیں رہی
دُنیا کبھی نہ صلح پہ مائل ہوئی مگر
باہم ہمیشہ برسرِ پیکار و کیں رہی
پایا اگر فروغ تو صرف اُن نفوس نے
جن کی کہ خضرِ راہ فقط شمعِ دیں رہی
اللہ ہی کی یاد بہر حال خلق میں
وجہِ سکونِ خاطرِ اندوہ گیں رہی

بزمِ طرب میں بھی جو حزیں تھے حزیں رہے
دل اُس کا اُس کے ساتھ ہے، کوئی کہیں رہے
رکھیں نہ ہم سے دوست اُمیدِ نشاطِ طبع
گو انجمن وہی ہے، ہم اب وہ نہیں رہے
پیدا زیادہ سب سے دلیلیں ہیں نے کیں
اور شبہے میں بھی سب سے زیادہ ہمیں رہے
کرتے تمام عمر چُناں اور چُنیں رہے
آخر میں کی نظر تو جہاں تھے وہیں رہے

اس بزم میں کیا آثار ملے ہنگامِ سحر سامانوں کے
اک داغ تھا شمع مردہ کا کچھ پر تھے پڑے پروانوں کے
ہستی کی یہ لہریں دامِ نظر دم بھر میں نشاں ان کا نہ اثر
گردابِ فنا میں غرق ہیں سب دریا ہیں رواں افسانوں کے
دل لذتِ نفس کا گرویدہ دنیا کی حقیقت پوشیدہ
اُمڈے ہیں فریب اُمیدوں کے طوفاں ہیں بپا ارمانوں کے
ہر گام پہ ہیں قبروں کے نشاں ہر سمت ہے اک عبرت کا سماں
اُجڑا ہے محل آبادی کا آباد ہیں گھر ویرانوں کے
دولت میں جو شرطِ عصیاں ہو بہتر ہے کہ قانع انساں ہو
غالب جو نہ ہوں شیطانوں پر تابع نہ ہوں وہ شیطانوں کے
یہ مدعیِ اسلام تو ہیں ساتھی ہیں مگر بیگانوں کے
تقوے کی وہ بو ہی ان میں نہیں وہ رنگ نہیں ایمانوں کے
تھی عقل زباں پر اے اکبرؔ اور عشق پہ رکھی ہم نے نظر
ممتاز رہے ہشیاروں میں سرخیل رہے دیوانوں کے

کوئی ہنس رہا ہے کوئی رو رہا ہے
کوئی پا رہا ہے کوئی کھو رہا ہے
کوئی تاک میں ہے کسی کو ہے غفلت
کوئی جاگتا ہے کوئی سو رہا ہے
کہیں نا امیدی نے بجلی گرائی
کوئی بیج اُمید کے بو رہا ہے
اسی سوچ میں مَیں تو رہتا ہوں اکبرؔ
یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیوں ہو رہا ہے

جلائے جب شعلۂ تحیر تو ذہن ڈھونڈے پناہ کس کی
یہ کس کے معنے ہوئے ہیں ثابت، یہ صورتیں ہیں گواہ کس کی

یہ چشمِ لیلیٰ کہاں سے آئی، یہ قلبِ مجنوں کہاں سے اُبھرا
جو با خبر ہیں انھیں خبر ہے نگاہ کس کی ہے آہ کس کی

جمالِ فطرت کے لاکھ پرتو قبولِ پرتو کی لاکھ شکلیں
طریقِ عرفاں میں کیا بتاؤں، یہ راہ کس کی، وہ راہ کس کی

یہ کس کے عشووں کا سامنا ہے کہ لذتِ ہوش ہو گئی گم
خودی سے کچھ ہو چلا ہوں غافل، پڑی ہے مجھ پر نگاہ کس کی

ہر قدم کہتا ہے تو آیا ہے جانے کے لیے
منزلِ ہستی نہیں ہے دل لگانے کے لیے

کیا مجھے خوش آئے یہ حیرت سرائے بے ثبات
ہوش اُڑنے کے لیے ہے، جان جانے کے لیے

دل نے دیکھا ہے بساطِ قوتِ ادراک کو
کیا بڑھے اس بزم میں آنکھیں اٹھانے کے لیے

خوب اُمیدیں بندھیں لیکن ہوئیں حرماں نصیب
بدلیاں اُٹھیں مگر بجلی گرانے کے لیے

سانس کی ترکیب پر مٹی کو پیار آ ہی گیا
خود ہوئی قید اس کو سینے سے لگانے کے لیے

جب کہا میں نے بھلا دو غیر کو، ہنس کر کہا
یاد پھر مجھ کو دلانا بھول جانے کے لیے

دیدہ بازی وہ کہاں، آنکھیں رہا کرتی ہیں بند
جان ہی باقی نہیں اب دل لگانے کے لیے

مجھ کو خوش آئی ہے مستی، شیخ جی کو فربہی
میں ہوں پینے کے لیے اور وہ ہیں کھانے کے لیے

اللہ اللہ کے سوا آخر رہا کچھ بھی نہ یاد
جو کیا تھا یاد، سب تھا بھول جانے کے لیے

سُر کہاں کے، ساز کیسا۔ کیسی بزمِ سامعین
جوشِ دل کافی ہے اکبر تان اُڑانے کے لیے

فغان و آہ کی لذت، جو دل ملے تو ملے
نشانِ نکہتِ گل جب کلی کھلے، تو ملے

وہ باغِ حسن ہیں لیکن ہے بند غنچۂ لب
مزا چمن کا اگر یہ کلی کھلے، تو ملے

ہوئی جو صلح تو اب احتیاط یہ کیسی
تکلفات کو نہ کیجیے، ملے تو ملے

میں شکوہ کرتا تھا اس وجہ سے نہ ملتے تھے — جو ترک کر دیے میں نے وہ سب گلے تو ملے
کھجا رہا ہے تو زخموں کو اپنے اے اکبر
پر اس کا لطف کوئی زخم اگر چھلے تو ملے

اس انجمن میں آکر راحت نصیب کس کو — پروانہ بھی جلے گا اور شمع بھی جلے گی
دنیا ابھارتی ہے آج اپنے عاشقوں کو — مرجائیں گے تو ان کا کل نام بھی نہ لے گی
دنیا کی آرزو سے خالق بچائے دل کو — پیدا ہوئی تو پی کر خونِ جگر پلے گی
عبرت زدہ جو دل ہو ارمان اس میں کیسے — بجلی گری ہو جس پر وہ شاخ کیا پھلے گی
جنت بنا سکے گا ہرگز کوئی نہ اس کو
دنیا یونہی چلی ہے اکبرؔ یونہی چلے گی

مشتاق نہیں ہیں زندگی کے — مرنا ہے تو کیا کریں گے جی کے
پائی نہ کسی میں بو وفا کی — چاہا تھا کہ ہو رہیں کسی کے
توحید کا مسئلہ ہے اصلی — باقی ہیں شگوفے ہسٹری کے
رندی کس کام کی یہ اکبر
ملتے نہیں جب کسی سے پی کے

غفلتوں کا خوب دیکھا ہے تماشا دہر میں — مدتیں گذری ہیں مجھ کو ہوش میں آئے ہوئے
خانۂ دل کو مرے توڑا تو کیا ایسی نمود — چشمِ بد دور آپ تو ہیں مسجدیں ڈھائے ہوئے
سیٹھ صاحب کے یہاں شادی ہے رندوں کو نوید — اچھے اچھے طائفے ہیں شہر میں آئے ہوئے
بائی جی نے سچ کہا لاؤ کوئی تازہ غزل — گیت کیا گاؤں گراموفون میں گائے ہوئے

ہو چکی دو دن کی شادابی اُڑا رنگِ بہار
پھول ہیں سوکھے ہوئے، غنچے ہیں مرجھائے ہوئے

دُنیا کا ذرا یہ رنگ تو دیکھ ایک ایک کو کھائے جاتا ہے
بن بن کے بگڑتا جاتا ہے اور بات بنائے جاتا ہے
انسان کی غفلت کم نہ ہوئی قانونِ فنا کی عبرت سے
ہر گام پہ کتنے پاؤں بھی ہیں اور سر بھی اُٹھائے جاتا ہے
اِس کو نہ خبر کچھ اُس کی ہے اُس کو ہے نہ کچھ پروا اِس کی
روتا ہے رلائے جاتا ہے، ہنستا ہے ہنسائے جاتا ہے
کچھ سوچ نہیں، کچھ ہوش نہیں، فتنوں کے سوا کچھ جوش نہیں
وہ لوٹ کے بھاگا جاتا ہے، یہ آگ لگائے جاتا ہے

بادہ نوشی میں بسر کرتے ہیں ایام کو ہم
خطِ تقدیر سمجھتے ہیں خطِ جام کو ہم
شکل اس شوخ کی آنکھوں میں پھرا کرتی ہے
آنکھیں دکھلاتے ہیں اب گردشِ ایام کو ہم
نظر آتی ہے جو گلزار میں پھولوں کی بہار
یاد کرتے ہیں حسینانِ گل اندام کو ہم

پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیرِ زنداں میں رہو
وحشتِ دل کا ہے ایما، راہِ صحرا لیجیے
خوش نما چیزیں ہیں بازارِ جہاں میں بے شمار
ایک نقدِ دل ہے یارب مول کیا کیا لیجیے
فصلِ گل کے آتے ہی اکبر ہوئے بے ہوش آپ
کھولیے آنکھوں کو صاحب، جامِ صہبا لیجیے

ہو نہ رنگین طبیعت بھی کسی کی یارب
آدمی کو یہ مصیبت میں پھنسا دیتی ہے

نگہِ لُطف تری بادِ بہاری ہے مگر غنچۂ خاطرِ عاشق کو کھلا دیتی ہے

کچھ زمزمہ سنجی ہی پہ موقوف نہیں لُطف نالے بھی کریں گے تو خوش آہنگ کریں گے
میلے ہیں حسینوں کے پری زادوں کے جمگھٹ اب جا کے قیام اپنا لبِ گنگ کریں گے

نالاں ہے اگر وہ تو یہ ہے چاک گریباں بلبل کی طرح گل بھی ہے دیوانہ کسی کا

مبارک مے کشو موسم پھر آیا بادہ خواری کا چمن میں شور ہے پھر آمدِ فصلِ بہاری کا
ہمارا غنچۂ خاطر شگفتہ کر نہیں سکتی فقط کلیاں کھلانا کام ہے بادِ بہاری کا
چمن میں خندہ زن گل ہے تو مے خانے میں پیمانہ یہاں ہے فیضِ ساقی واں کرم بادِ بہاری کا
مسخر کرتا ہوں پریوں کو میں جادو بیانی سے حسینوں میں فسانہ ہے مری ذی اختیاری کا

تمہارا سایہ بھی جو لوگ دیکھ لیتے ہیں وہ آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے پری کی طرف

جو یوں ہی لحظہ لحظہ داغِ حسرت کی ترقی ہے عجب کیا رفتہ رفتہ میں سراپا صورتِ دل ہوں
مدد اے رہنمائے گم رہاں اس دشتِ غربت میں مسافر ہوں پریشاں حال ہوں گم کردہ منزل ہوں
یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہوں دونوں کا قائل ہوں
اگر دعوائے یک رنگی کروں ناخوش نہ ہو جانا میں اس آئینہ خانہ میں ترا عکسِ مقابل ہوں

جو لذت آشنائے موردِ اُلفت ہے وہ دل ہوں
اجل جس کو قیامت تک نہ آئے گی وہ بسمل ہوں

عجب مضموں ہوں پیدا ہوا ہوں بیتِ ہستی میں
عبارت میں بہت آساں ہوں معنی میں مشکل ہوں
جسے چشمِ تصور خواب میں بھی پا نہیں سکتی
سراپا چشم ہو کر میں اُسی محفل میں داخل ہوں
رہِ اُلفت میں آتی ہے یہی آواز ہر رخ سے
کہ میں بھی اِک شرارِ شعلۂ بے تابیٔ دل ہوں
وہ مجنوں ہوں کہ جس کی ہر نظر تصویرِ لیلیٰ ہے
حجابِ حسن اُٹھ جاتا ہے جس سے میں وہ محمل ہوں

کہیں دل ہوں کہیں میں باعثِ بے تابیِ دل ہوں
کہیں اندازِ بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں
کہیں تمکینِ خوبی ہوں کہیں ہنگامۂ اُلفت
کہیں رنگِ رُخِ گل ہوں کہیں شورِ عنادل ہوں
کہیں جلوہ ہوں صحت کا کہیں ہوں شاہدِ معنی
کہیں ہوں محملِ لیلیٰ، کہیں لیلائے محمل ہوں
کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا
روانی میں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں

اثر بعدِ فنا بھی گردشِ قسمت کا باقی ہے بگولا بن کے پیری سے ناک ...
سُناتا ہوں جو افسانہ کسی کی بزمِ عشرت میں
نسیمِ نو بہاری رقص کرتی ہے گلستاں میں

ابھی تو موسمِ گل بھی نہ آیا تھا گلستاں میں / میں کیوں جامہ سے باہر ہو گیا شوقِ بیاباں میں
نظر آتا نہیں جز آہ کوئی مونس و ہمدم / بدل جاتی ہے دنیا کی ہوا شب ہائے ہجراں میں
میں دیتا جاؤں یارانِ وطن کو کیا پتہ اپنا / خدا جانے مجھے لے جائے وحشت کس بیاباں میں
سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے جب فصلِ بہاری کا / گلوں کو یاد کر کے خوب روتا ہوں گلستاں میں

پھر گئی آپ کی دو دن میں طبیعت کیسی / یہ وفا کیسی تھی صاحب! یہ مروّت کیسی
دوست احباب سے ہنس بول کے کٹ جائے گی رات / رند آزاد ہیں، ہم کو شبِ فرقت کیسی
جس حسیں سے ہوئی الفت وہی معشوق اپنا / عشق کس چیز کو کہتے ہیں، طبیعت کیسی
ہے جو قسمت میں وہی ہوگا، نہ کچھ کم نہ سوا / آرزو کہتے ہیں کس چیز کو، حسرت کیسی
حال کھلتا نہیں کچھ دل کے دھڑکنے کا مجھے / آج رہ رہ کے بھر آتی ہے طبیعت کیسی
کوچۂ یار میں جاتا تو نظارہ کرتا / قیس آوارہ ہے جنگل میں، یہ وحشت کیسی

میری آنکھیں نوح کے طوفاں کی دکھلاتی ہیں سیر / اُن کی چتون نے تو دکھلایا تماشا حشر کا

محبت ہو نہ ہو ان کو مجھے کیا میں تو عاشق ہوں / نہ ہونے سے ہے اس کے کیا اگر ہوتی تو کیا ہوتا

حیائے حُسن انہیں ہے، حجابِ عشق مجھے / غرض وہ آ نہیں سکتے میں جا نہیں سکتا

محروم ہی رہ جاتی ہے آغوشِ تمنّا / شرم آ کے چُرا لیتی ہے سارا بدن ان کا
ہر بات میں وہ چال کیا کرتے ہیں مجھ سے / اُلفت نہ نبھے گی جو یہی ہے چلن ان کا
ہے صاف نگاہوں سے عیاں جوشِ جوانی / آنکھوں سے سنبھلتا نہیں متانہ پن ان کا

یہ شرم کے معنی ہیں، حیا کہتے ہیں اس کو
آغوش تصوّر میں نہ آیا بدن ان کا

دل چسپ ہے، آفت ہے، قیامت ہے، غضب ہے
بات اُن کی، ادا اُن کی، قد ان کا، چلن ان کا

حاصلِ عمر سوا موت کے جب کچھ بھی نہیں
چار دن کے لیے یہ عیش و طرب کچھ بھی نہیں

وجہ کیا تم سے کہوں اس کی طبیعت ہی تو ہے
دل کو اک جوش ہے روتا ہوں سبب کچھ بھی نہیں

نہ وہ احباب، نہ وہ لوگ، نہ وہ شمع، نہ بزم
صبح دم وہ اثرِ جلسۂ شب کچھ بھی نہیں

کوئی اکبرؔ سا بھی دیوانہ نظر آیا ہے کم
پہروں روتا ہے جو پوچھو تو سبب کچھ بھی نہیں

میں جن کے دیکھنے کو سمجھتا ہوں زندگی
ان کا یہ حال ہے کہ ادھر دیکھتے نہیں

تاثیرِ انتظار نے یہ حال کر دیا
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر دیکھتے نہیں

ترچھی چتون سے خدا جانے وہ دیکھیں مجھے کب
موت کا وقت کسی شخص کو معلوم نہیں

غم ہے اتنا کہ دلِ زار پہ قابو بھی نہیں
ضبط یہ ہے کہ کہیں آنکھ میں آنسو بھی نہیں

کیا مرے عہد میں بدلی ہے گلستاں کی ہوا
رنگ کیسا کہ کسی پھول میں خوشبو بھی نہیں

صحبتِ باہم میں تو اب روز رہتا ہے فساد
ہم سے اُن سے دور کی صاحب سلامت خوب تھی

فلک نے کیوں شبِ فرقت مجھے ہلاک کیا
جمالِ یار نہیں تھا تو کیا سحر بھی نہ تھی

جو آپ ہوتے ہیں منکر تو خیر میں جھوٹا
مرا جگر بھی نہ تھا آپ کی نظر بھی نہ تھی

نگاہِ قہر سے دیکھا، یہی غنیمت ہے
مجھے تو آپ سے امید اس قدر بھی نہ تھی

پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں　　سچ تو یہ ہے کہ محبّت بھی بلا ہوتی ہے
جسم تو خاک میں مل جاتے ہوئے دیکھے ہیں　　رُوح کیا جانے کدھر جاتی ہے کیا ہوتی ہے

رندوں میں تو ہے لطفِ مے و ساقی و مطرب　　واعظ یہ بتا تو تری صحبت میں بھی کچھ ہے
گو رازِ محبت کا چھپانا ہے بہت خوب　　لیکن بخدا لطف تو شہرت میں بھی کچھ ہے

رنگ اُڑانا اہلِ یورپ کا تو ہے اکبر محال　　مُفت اپنے آپ کو تم نے تماشا کر دیا

نہ ملنے ہی سے اکثر رنج بھی ہو جاتے ہیں پیدا　　جو سچ پوچھو تو ملنے سے نہ ملنے کا گلا اچھا

اکبر کی تمناؤں سے کہتا ہے یہ گردوں　　اس دور سے اُٹھنے کا نہیں بار تمہارا

یہ سُست ہے تو پھر کیا، وہ تیز ہے تو پھر کیا　　نیٹو جو ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا
رہنا کسی سے دب کر ہے امن کو ضروری　　پھر کوئی فرقہ ہیبت انگیز ہے تو پھر کیا
رنج و خوشی کی سب میں تقسیم ہے مناسب　　بابو جو ہے تو پھر کیا، چنگیز ہے تو پھر کیا
ہر رنگ میں ہیں پاتے بندے خدا کے روزی　　ہے پینٹر تو پھر کیا، رنگریز ہے تو پھر کیا
جیسی جسے ضرورت ویسی ہی اس کی چیزیں　　یاں تخت ہے تو پھر کیا، واں میز ہے تو پھر کیا
مفقود ہیں اب اس کے سننے سمجھنے والے　　میرا سخن نصیحت آمیز ہے تو پھر کیا

مے خانۂ رفارم کی چکنی زمین پر　　واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا
کیسی نماز بال میں ناچو جنابِ شیخ　　تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

یہ پاس اور وہ پاس نہ موجد نہ اہلِ زر
اخبار میں جو چھپ گئے ارمان نکل گیا

اُس مس پہ کون میرے سوا ہو فریفتہ
گاہک میں ہی ہوں ہند میں لندن کے مال کا
رکھنا پڑا ہے اُس بُتِ کافر سے میل جول
موقع نہیں ہے بحثِ حرام و حلال کا

پُرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اُسے کشتی نہیں ملتی اِسے ساحل نہیں ملتا
کتابِ دل مجھے کافی ہے اکبر درسِ حکمت کو
میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مِل نہیں ملتا

مری تقریر کا اُس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا
جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا
کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہِ حبِ قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا، وہ بولے تو نہیں چلتا
کہا پیرِ طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھی
تہذیب کی میں اُس کو تجلّی نہ کہوں گا
لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو اُبھارے
اُس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

قتل سے پہلے ہی کلوروفارم
شُکر ہے اُن کی مہربانی کا
شیخ درگور و قوم درکالج
رنگ ہے دورِ آسمانی کا
انجن آیا نکل گیا زن سے
ق
سُن لیا نام آگ پانی کا
بات اتنی اور اس پہ یہ طومار
غُل ہے یورپ میں جانفشانی کا

عزّت مِلی ہے شرکتِ کونسل کی شیخ کو
غازہ مِلا گیا ہے رُخِ فاقہ مست پر

غریبوں سے لپٹ جاتی ہے دنیا فکرِ ناں ہو کر — امیروں کے مقابل ہوتی ہے حسنِ بتاں ہو کر

مری نسبت یہ فرماتے ہیں واعظ بدگماں ہو کر — قیامت ڈھائے گا جنت میں یہ بوڑھا جواں ہو کر

ہم مصلحتِ وقت کے منکر نہیں اکبر — لیکن یہ سمجھ لو کہ وفا بھی ہے کوئی چیز

نہ خوشی ہوتی ہے دل کو نہ طبیعت کو ابھار — پھر بھی سالانہ کیے جاتے ہیں ہم عید ہنوز

مل گیا شرع سے شراب کا رنگ — خوب بدلا غرض جناب کا رنگ
چل دیے شیخ صبح سے پہلے — اُڑ چلا تھا ذرا خضاب کا رنگ
پائی ہے تم نے چاند سی صورت — آسمانی رہے نقاب کا رنگ
صبح کو آپ ہیں گلاب کا پھول — دوپہر کو ہے آفتاب کا رنگ
رندِ عالی مقام ہے اکبر — بُو ہے تقویٰ کی اور شراب کا رنگ

عزیزانِ وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل — یگانوں میں رہو بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل
نہ سحرِ چشمِ جاناں ہے نہ لطفِ غمزۂ ساقی — تو پھر صحنِ چمن میں دیدۂ نرگس سے کیا حاصل
نہ ہو ادراک خالق کا نہ اُبھرے شوق طالب کا — تو ایسے ذہن سے اکبر اور ایسے حس سے کیا حاصل

خوشی بہت ہے جہاں میں ہمارے گھر نہ سہی — ملول کیوں رہیں دنیا کے انتظام سے ہم
خوشامدی کو مبارک ہو رات دن چکر — یہاں تو رکھتے ہیں بس کام اپنے کام سے ہم
اخیر عمر میں آیا ہمیں خیال مآل — بہت دنوں میں ہوئے واقف اپنے کام سے ہم

گناہ کیا جو کہیں ہم بھی السلام علیک
کہ لطف اٹھاتے ہیں اس بت کی رام رام سے ہم

ہمیں ہے یاد وہ عہدِ الست اے غافل
بہل سکیں گے نہ دنیا کی دھوم دھام سے ہم

چلا ہے فلسفہ لے کر ہمیں سوئے ظلمات
بہت ہی تنگ ہیں اس اسپِ بے لگام سے ہم

خیالِ یار میں اُلجھا ہوا ہے تارِ نفس
کبھی نہ ہوں گے رہا عاشقی کے دام سے ہم

جبیں کے عشق سے آخر بچی نہ جان اپنی
تمام ہو گئے اس ماہِ ناتمام سے ہم

اگر وہ کہتے ہیں املی تو ہم کہیں گے یہی
ضرور کیا ہے کریں بحث جا کے آم سے ہم

مِلا نہ امن شبستانِ دہر میں دم بھر
چراغِ صبح رہے اس جہاں میں شام سے ہم

اب اور چاہیے نیٹو کے واسطے کیا بات
یہی بہت ہے مشرّف ہوئے سلام سے ہم

نگاہِ پیرِ مغاں کہتی ہے غریبوں سے
رہِ سلوک میں واقف ہیں ہر مقام سے ہم

فلک کے دَور میں ہارے ہیں بازیِ اقبال
اگرچہ شاہ تھے بدتر ہیں اب غلام سے ہم

چھڑی اُٹھائی، خموشی سے چل دیے اکبر
سفر میں رکھتے نہیں کام ٹیم ٹام سے ہم

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

بحرِ ہستی میں ہوں مثالِ حباب
مٹ ہی جاتا ہوں جب ابھرتا ہوں

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے
سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

آپ کیا پوچھتے ہیں میرا مزاج
شکر اللہ کا ہے، مرتا ہوں

یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر
دل میں جو آئے کہہ گزرتا ہوں

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

کشتیِ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر | نا خدا ملتے ہیں لیکن با خدا ملتا نہیں
زندگانی کا مزہ ملتا تھا جن کی بزم میں | ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتا ملتا نہیں
پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر | کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ بدنامی سے بچنا چاہیے | کہہ دو بے اس کے جوانی کا مزا ملتا نہیں

کس قدر بے فیض ان روزوں ہوائے دہر ہے | بوئے گل کو دامنِ بادِ صبا ملتا نہیں
نیشنل وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبرؔ کو غم | آ فیشل عزت کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں
دل کی ہمدردی سے کچھ تسکین ہوتی تھی مگر | اب تو اس مظلوم کا بھی کچھ پتا ملتا نہیں
بے کسی میری نہ پوچھ اے جادۂ راہِ طلب | کارواں کیسا کہ کوئی نقشِ پا ملتا نہیں
جب کہیں ملتا ہے کرتا ہے نہ ملنے کا گلہ | اور جو ملنے جاتا ہوں مردِ خدا ملتا نہیں
یوں کہو مل آؤں ان سے لیکن اکبرؔ سچ یہ ہے | دل نہیں ملتا تو ملنے کا مزا ملتا نہیں

دنیا کے انتظام پہ اکبرؔ نہ ہو ملول | انصاف یہ نہیں ہے کہ پا جاؤ سب تمہیں

موسمِ گل میں صبا کو جو ہوئی ناچ کی دھن | لحنِ بلبل سے بھی پیدا ہوئی کھماچ کی دھن
یہ کلاک اچھے سُروں میں تو بجا کرتی ہے | مُفت پیدا ہوئی ہے آپ کو کیوں واچ کی دھن
نغمہ سنجی سے بھی آتی تھی خواتین کو شرم | سازِ مغرب سے مگر ہو گئی اب ناچ کی دھن

کبھی دل کی ترنگ کا رنگ یہ ہے کہ میں سارے جہان کو پیار کروں
کبھی طبع میں موج سماتی ہے یہ کہ خود اپنی خودی سے بھی عار کروں

کبھی غنچہ ہے یہ کبھی شعلہ ہے یہ کبھی آئینہ ہے کبھی قطرۂ خوں
یہ ہے صفحۂ دہر یہ دل کا جو رنگ اسے کون سی مد میں شمار کروں

دل زیست سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں
سینے میں نفس بار ہے معلوم نہیں کیوں
اقرار وفا یار نے ہر اک سے کیا ہے
مجھ سے ہی بس انکار ہے معلوم نہیں کیوں
ہنگامۂ محشر کا تو مقصود ہے معلوم
دہلی میں یہ دربار ہے معلوم نہیں کیوں
افلاس میں مستی تو مجھے خوش نہیں آتی
ساقی کو یہ اصرار ہے معلوم نہیں کیوں
انداز تو عشاق کے پائے نہیں جاتے
اکبر جگر افگار ہے معلوم نہیں کیوں
جینے پہ تو جاں اہل جہاں دیتے ہیں اکبر
پھر بھی تجھے دشوار ہے معلوم نہیں کیوں

ہیں کلکٹر نزع میں، عملے کھڑے ہیں دم بخود
جب خدا ہی ہو گیا حاضر تو ناظر کیا کریں

مستیِ عشق کا مزہ عہدِ شباب ہی میں ہے
بادہ کشی کا لطف اگر ہے تو فقط بہار میں

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں
ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں
حضرتِ ہوش ہیں گو دل کے وفادار رفیق
آپ کی یاد جو آتی ہے تو چل دیتے ہیں

عاشقوں کی زیست پر کیونکر نہ رشک آئے مجھے
زندگی کے بھی مزے پھر موت سے غافل نہیں

تخت کے قابض وہی، دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک اُن کا، رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آگیا تارِ امید و بیم ان کے ہاتھ میں

ہم کو سائے پر جنوں، وہ دھوپ میں مصروفِ کار
مس یہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے
سب کی ہے تذلیل اور تعظیم ان کے ہاتھ میں

شیخ کی جانب کوئی جاتا نہیں کہتے ہیں سب
ہے فقط اب کوثر و تسنیم ان کے ہاتھ میں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی
ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم ان کے ہاتھ میں

دلیلیں فلسفہ کو نورِ باطن کر نہیں سکتیں
کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

ضروری چیز ہے اک تجربہ بھی زندگانی میں
تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہم سن کر نہیں سکتیں

طلب کر دین سے اے محوِ نیچر جوشِ بامعنی
صدائیں مُرغ کی کارِ مؤذن کر نہیں سکتیں

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں میرا نشیمن تھا کہاں
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے وہ گلشن تھا کہاں

کیا زورِ طبع ہو کہ نہیں کوئی معترض
کیا نکتہ سنجیاں ہوں کوئی نکتہ چیں نہیں

میں تم سے کیا بتاؤں کہ اس وقت ہوں کہاں
جب تم ہو پیشِ چشم تو پھر میں کہیں نہیں

جب سے گناہ چھوڑ دیے سب کھسک گئے
اب کوئی میرا دوست نہیں، ہم نشیں نہیں

اکبر ہمارے عہد کا اللہ رے انقلاب
گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں

اجل کی نیند آجاتی ہے آخر سننے والے کو
قیامت کا اثر پاتا ہوں دنیا کی کہانی میں

حباب اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہوا گذرا
تماشا تھا ہوا نے اک گرہ دے دی تھی پانی میں

نہ پوچھ اے ہمنشیں وہ قصۂ عیش وطرب ہم سے کسے اب یاد ہے اک خواب دیکھا تھا جوانی میں

واعظ ہمیں یہ وعظ کا دفتر سنائے کیوں ہم پوچھتے ہیں عالمِ ہستی میں آئے کیوں
موسیقی و شراب و جوانی و حُسن و ناز بچتا ہے کون اور خدا بھی بچائے کیوں

اکبرؔ کی بُرائی اچھائی تو پوچھ محلّے والوں سے
نظم ان کی سُنی ہے البتہ، ہاں شعر تو اچھے کہتے ہیں

شوخ ایسا ہے کہ اس بت کو اگر کافر کہو ہنس کے کہتا ہے کہ پیارا لفظ ہے یہ پھر کہو
جو کہو چھا جائے ان آنکھوں پہ مستی کی طرح فتنۂ دوراں کہو، ساقی کہو، ساحر کہو
قیمتِ دل سُن کے کہتے ہو کہ سودا ہے تجھے
خیر سودا ہی سہی تم بھی تو کچھ آخر کہو

جلایا دل کو تڑپایا جگر کو خدا رکھے سلامت اس نظر کو
دلِ سوزاں کی گرمی بڑھتی ہے اور خدا کے واسطے پہلو سے سر کو

آبرو چاہو اگر انگریز سے ڈرتے رہو ناک رکھتے ہو تو تیغِ تیز سے ڈرتے رہو

جانتا ہوں میں شبِ وصل کی کوتاہی کو یہ دعا ہے کہ مری عمر سے کوتاہ نہ ہو
یہ ادائیں، یہ لگاوٹ، یہ بلا کی چتون میں تو کیا، ضبط فرشتوں سے بھی واللہ نہ ہو
اک زمانہ ہے مرے قصۂ غم سے واقف اس کا باعث جو ہے شاید وہی آگاہ نہ ہو

چشمِ کافر کا اشارہ ہے کہ ایماں کیسا
چہرہ ہنستا ہے کہ دیکھو کوئی گمراہ نہ ہو
خیر خواہ آج زمانہ میں کہاں ملتے ہیں
ہے یہی لاکھ غنیمت کوئی بدخواہ نہ ہو

سب ہو چلے ہیں اس بتِ کافر ادا کے ساتھ
رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ

سیدؔ[۱] سے علی گڑھ میں یہ جا کر کوئی کہہ دے
ہے تجھ کو طلب قوم کی قسمت سے زیادہ
مجھ رند سے اس درجہ نہ ہو محترز اے شیخ
تو پاک نہیں ہے مری نیت سے زیادہ

بادۂ عرفاں کی مستی روح کو بھا ہی گئی
عقل سر میں رہ گئی، دل میں کچھ اور آ ہی گئی
عاشقوں میں رسمِ عیشِ دنیوی رائج نہیں
قیس کب دولہا بنا، لیلیٰ کہاں بیاہی گئی
سیکھ لو بدلی سے تم طرزِ عمل اے عالمو
جو سمندر سے لیا تھا ہم پہ برسا ہی گئی
اپنے تمکین و تحمل پر بہت نازاں تھا میں
اک بتِ کافر کی چشمِ مست تڑپا ہی گئی

کچھ طرزِ ستم بھی ہے کچھ اندازِ وفا بھی
کھلتا نہیں حال ان کی طبیعت کا ذرا بھی
عشوہ بھی ہے، شوخی بھی، تبسم بھی، حیا بھی
ظالم میں اور اک بات ہے ان سب کے سوا بھی
سنتے ہیں کہ اکبرؔ نے کیا عشقِ بتاں ترک
اس بات سے تو خوش نہ ہوا ہوگا خدا بھی

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی
کہ صرصر سے بدتر صبا ہو گئی
وہ اُٹھے تو لاکھوں ہی فتنے اٹھے
چلے تو قیامت بپا ہو گئی

---

[۱] سر سید احمد خاں

محبت کی گرمی بھی کیا چیز ہے — طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی
لگاوٹ بہت ہے تری آنکھ میں — اسی سے تو یہ فتنہ زا ہو گئی

وہ ساری اُمیدیں ملیں خاک میں — جو بدلی اُٹھی تھی ہوا ہو گئی

فارسی اُٹھ گئی، اُردو کی وہ عزت نہ رہی — ہے زباں مُنہ میں مگر اس کی وہ قوت نہ رہی
بند کر اپنی زباں، ترکِ سخن کر اکبرؔ — اب تری بات کی دُنیا کو ضرورت نہ رہی

روز افزوں ہو محبت وہ ملاقات اچھی — شوق ملنے کا بڑھاتی رہے وہ بات اچھی
موقعِ بحث نہیں صاحبِ اقبال ہیں آپ — میری ہر بات بُری، آپ کی ہر بات اچھی
بارِ خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد بُرا — دل کو بھا جائے تو اکبرؔ کی خرافات اچھی

ختم کیا صبا نے رقص، گل پہ نثار ہو چکی — جوشِ نشاط ہو چکا صوتِ ہزار ہو چکی
رنگِ بنفشہ مٹ گیا، سنبلِ تر نہیں رہا — صحنِ چمن میں زینتِ نقش و نگار ہو چکی
مستیٔ لالہ اب کہاں اس کا پیالہ اب کہاں — دورِ طرب گزر گیا آمدِ یار ہو چکی
رُت وہ جو تھی بدل گئی آئی بس اور نکل گئی — تھی جو ہوا میں نکہتِ مشکِ تتار ہو چکی
اب تک اُسی روش پہ ہے اکبرِؔ مست و بے خبر — کہہ دے کوئی عزیزِ من فصلِ بہار ہو چکی

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرم جوشی کی — کہ آخر مسلموں میں رُوح پھونکی بادہ نوشی کی
تمہاری پالسی کا حال کچھ کھلتا نہیں صاحب — ہماری پالسی تو صاف ہے ایماں فروشی کی
چھپانے کے عوض چھپوا رہے ہیں خود وہ عیب اپنے — نصیحت کیا کروں میں قوم کو اب عیب پوشی کی

پہننے کو تو کپڑے ہی نہ تھے، کیا بزم میں جاتے
خوشی گھر بیٹھے کرلی ہم نے جشنِ تاجپوشی کی

رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں
حماقت حاکموں سے ہے توقع گرم جوشی کی

دشتِ غربت ہے، علالت بھی ہے، تنہائی بھی
اور ان سب پہ فزوں بادیہ پیمائی بھی

خواب راحت ہے کہاں، نیند بھی آتی نہیں اب
بس اُچٹ جانے کو آئی جو کبھی آئی بھی

یاد ہے مجھ کو وہ بے فکری و آغازِ شباب ق
سخن آرائی بھی تھی، انجمن آرائی بھی

نگہِ شوق و تمنا کی وہ دل کش تھی کمند
جس سے ہو جاتے تھے رام آہوئے صحرائی بھی

ہم صنم خانہ جہاں کرتے تھے اپنا قائم
پھر کھڑے ہوتے تھے واں حور کے شیدائی بھی

اب نہ وہ عمر، نہ وہ لوگ، نہ وہ لیل و نہار
بجھ گئی طبع کبھی جوش پہ گر آئی بھی

اب تو شیشے بھی مجھے دیو نظر آتے ہیں
اس زمانہ میں پری زاد تھی رسوائی بھی

کام کی بات جو کہنی ہو وہ کہہ لو اکبر
دم میں چھین جائے گی یہ طاقت گویائی بھی

عاشقیِ شاہدِ کالج ہے بربادیِ عمر
پاس تک پہنچے نہیں ہم اور جوانی ہو چکی

حضرتِ دل ہو گئے اس عہد میں جزوِ شکم
کیجیے عرضی نویسی، شعر خوانی ہو چکی

اپنا رنگ ان سے ملانا چاہیے
آج کل پینا پلانا چاہیے

خوب وہ دکھلا رہے ہیں سبز باغ
ہم کو بھی کچھ گل کھلانا چاہیے

کچھ نہ ہاتھ آئے مگر عزت تو ہے
ہاتھ اس مس سے ملانا چاہیے

ہم اُن کی خوشی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے
لیکن وہ جفاؤں کے سوا کچھ نہیں کرتے

وہ کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے، ہم کہتے ہیں جی ہاں
بالفعل تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کرتے
بُت خانے سے کچھ فیض نہ ہوگا تمہیں اکبرؔ
تم یاں بھی بجز یادِ خدا کچھ نہیں کرتے

نہ بہتے اشک تو تاثیر میں سوا ہوتے
صدف میں رہتے یہ موتی تو بے بہا ہوتے
مجھ ایسے رند سے رکھتے ضرور ہی الفت
جنابِ شیخ اگر عاشقِ خدا ہوتے
گناہ گاروں نے دیکھا جمالِ رحمت کو
کہاں نصیب یہ ہوتا جو بے خطا ہوتے
جنابِ حضرتِ ناصح کا واہ کیا کہنا
جو ایک بات نہ ہوتی تو اولیا ہوتے
مذاقِ عشق نہیں شیخ میں یہ ہے افسوس
یہ چاشنی بھی جو ہوتی تو کیا سے کیا ہوتے
محلِّ شکر ہیں اکبرؔ یہ درفشاں نظمیں
ہر اک زباں کو یہ موتی نہیں عطا ہوتے

زبان و چشمِ بُتاں کا نہ پوچھیے عالم
وہ شوخیوں کے لیے ہے، یہ ہے حیا کے لیے

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا
انسان اڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے
ازراہِ تعلق کوئی جوڑا کرے رشتہ
انگریز تو نیٹو[1] کے چچا ہو نہیں سکتے
نیٹو نہیں ہو سکتے جو گورے تو ہے کیا غم
گورے بھی تو بندے سے خدا ہو نہیں سکتے
ہم ہوں جو کلکٹر تو وہ ہو جائیں کمشنر
ہم اُن سے کبھی عہدہ برا ہو نہیں سکتے

ڈنر کا مجھ کو نہیں ہے چسکا، وگرنہ ہے کارڈ میں تو لکھا
شراب ہوگی، کباب ہوں گے، حضورِ عالی جناب ہوں گے

---

[1] native مقامی باشندہ - یہاں مراد ہندوستانیوں سے ہے۔

عبث ہر طاقت و دولت پہ تجھ کو رشک و حسرت ہے
نہ ہر طاقت میں نیکی ہے، نہ ہر دولت میں راحت ہے
تعجب ہے مجھے ان شاعروں کے شور و غوغا پر
کوئی پوچھے کہ تم کو کیا، جو کوئی خوب صورت ہے
فنا کا دور جاری ہے مگر مرتے ہیں جینے پر
طلسمِ زندگانی بھی عجب اک رازِ فطرت ہے

آدمی کے لیے دنیا میں مصائب ہیں بہت
خوش نصیبی ہے جو وہ صبر کی عادت رکھے
کیا بتاؤں تمہیں اچھائی کی پہچان اکبر
بس وہی خوب ہے جو تم سے محبت رکھے

میرے حواس عشق میں کیا کم ہیں منتشر
مجنوں کا نام ہو گیا قسمت کی بات ہے
راضی تو ہو گئے ہیں وہ تاثیرِ عشق سے
موقع نکالنا سو یہ حکمت کی بات ہے

قیامت کر رہی ہیں لعبتانِ مغربی اکبر
تھیئٹر کو بڑھایا ہے انھیں حوروں نے جنت سے

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجیے
آپ اپنی عزتِ دربار رہنے دیجیے
چھوڑنے کا میں نہیں اب آپ کو اے جانِ جاں
ہے اگر مجھ پر خدا کی مار رہنے دیجیے
کھل گیا مجھ پر بہت ہیں آپ میرے خیر خواہ
خیر چندہ لیجیے طومار رہنے دیجیے
ٹیمز میں ممکن نہیں نظارۂ موجِ فرات
ایسی خواہش کو سمندر پار رہنے دیجیے

سو رنگِ تصور میں ہم اے جاں در آئے
ہر رنگ میں تم آفتِ ایماں نظر آئے

اے خضر مری راہ تو بس راہِ جنوں ہے
منزل کو غرض ہو تو خود اس راہ پر آئے

دل جس طرف آیا ہے وہ معلوم ہے مجھ کو
ناصح سے تو پوچھو کہ یہ حضرت کدھر آئے

یہ حسن بتوں کا، یہ جنوں خیز نگاہیں
پتھر کا بھی دل ہو تو ادھر لوٹ کر آئے

بے تابیاں نصیب میں تھیں ورنہ ہم نشیں
یہ کیا ضرور تھا کہ انھیں پر نظر پڑے

دین و ملّت کی ترقی کا خیال اچھا ہے
اصل مضبوط ہو جس کی وہ نہال اچھا ہے

بخدا ہند کے پُرزے بھی غضب ڈھاتے ہیں
یہ غلط ہے کہ ولایت ہی کا مال اچھا ہے

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا چہلم اس کا
پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

سیّد[1] کی روشنی کو اللہ رکھے قائم
بتّی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے

کیا خوب پڑھ رہے تھے مصرعے مہنت صاحب
بھنڈار تو ہے خالی، بھاری مگر بھرم ہے

اگرچہ مغرب سے ساز دل ہے مریدِ آہنگِ مشرقی ہوں
اگر پیانو ہے انجمن میں محلِ خلوت میں بین بھی ہے
ہمارے جھگڑوں کی کچھ نہ پوچھو، تمام دنیا ہے اور ہم ہیں
کہ جیب میں زر ہے، گھر میں زن ہے، خراج پر کچھ زمین بھی ہے
ہمارا خنجر بھی بدنما ہے اور ان کی سوئی بھی ہے وہ آفت
کہ صاف بھی ہے، چمک بھی رکھتی ہے، گول بھی ہے، مہین بھی ہے

---

[1] سر سیّد احمد خاں

شیخ کعبہ میں کلیسا میں برہمن بیٹھے
ہم تو کوچے میں ترے مار کے آسن بیٹھے

شوخیاں شوق سے کر مجھ کو بھی لطف آتا ہے
کہا تو نے کہ نچلا مرا دامن بیٹھے

ہوں میں وہ رند اگر حشر میں ملزم ٹھہروں
فیصلے کے لیے حوروں کا کمیشن بیٹھے

ہند سے آپ کو ہجرت ہو مبارک اکبرؔ
ہم تو گنگا ہی پہ اب مار کے آسن بیٹھے

پراگندہ بہت ہے دل مرا دنیا کے دھندوں سے
چھڑا دے مجھ کو یارب نوکری کے سخت پھندوں سے

غلامانہ طریقوں پر مجھے مجبور کرتے ہیں
خدایا بے نیازی دے مجھے ان خود پسندوں سے

مسلمانوں کی خوش حالی کی بے شک دھن ہے سید کو
مگر یہ کام نکلے گا نہ لکچر سے نہ چندوں سے

درستی تخت و عزت کی کہاں اب کیل کانٹوں میں
توقع شہسواری کی نہ رکھو نعل بندوں سے

کجا وہ گیسوئے مشکیں کجا یہ ڈھیلی اینچیں
دلِ وحشیِ اکبرؔ پھنس چکا ایسی کمندوں سے

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

تری دیوانگی پر رحم آتا ہے ہمیں اکبرؔ
کوئی دن وہ بھی ہوگا ہم تجھے انسان دیکھیں گے

میں جو روتا ہوں کہ افسوس زمانہ بدلا
مجھ پہ ہنستا ہے زمانہ کہ تمہیں وہ نہ رہے

وہ عشق کیا جو نہ ہو ہادیِ طریقِ کمال
جو عقل کو نہ بڑھائے وہ شاعری کیا ہے

ہر ایک کو ہے زمانہ میں زندگی مقصود
کسے خبر ہے کہ مقصودِ زندگی کیا ہے

اس انقلاب کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں
زمانہ کہتا ہے دیکھا کرو ابھی کیا ہے

مرے اجداد بھی ڈرتے تھے اکبرؔ میں بھی ڈرتا ہوں
مگر ان کو گناہوں سے تھا ڈر اور مجھ کو مرنے سے
نشاں اللہ کا اس راہ میں دیتا نہیں واعظ
بجا ہے ہمّتِ مسلم جو رُکتی ہے اُبھرنے سے

مسلمانوں کو لُطف و عیش سے جینے نہیں دیتے
خدا دیتا ہے کھانا شیخ جی پینے نہیں دیتے

کیوں نہ ہوتا دیپ کالج بے ثمر
کس نے دیکھا بید کو پھلتے ہوئے

سب میں وحشت ہے زمانہ کے بدل جانے سے
دل اب اپنے سے نہ ملتا ہے نہ بیگانے سے
جب ہمیں وہ نہ رہے پھر یہ بدلنا کیسا
یہ کہو مٹ گئے دنیا کے بدل جانے سے
شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے
حکم اکبرؔ کو ہوا ہے کہ کرو ترکِ سخن
خواجہ حافظؔ بھی نکالے گئے میخانے سے

دم لبوں پر تھا دلِ زار کے گھبرانے سے
آ گئی جان میں جان آپ کے آجانے سے
تیرا کوچہ نہ چھٹے گا ترے دیوانے سے
اس کو کعبہ سے نہ مطلب ہے نہ بت خانے سے
شیخ نافہم ہیں کرتے جو نہیں قدر اس کی
دل فرشتوں کے ملے ہیں ترے دیوانے سے
میں جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں
کارِ دنیا نہ رُکے گا ترے مرجانے سے
کون ہمدرد کسی کا ہے جہاں میں اکبرؔ
ایک اُبھرتا ہے یہاں ایک کے مٹ جانے سے

کل تک محبّتوں کے چمن تھے کھِلے ہوئے
دو دل بھی آج مل نہیں سکتے ملے ہوئے
اچھے وہی ہیں آج جو سوتے ہیں زیرِ گِل
افسوس ہے انھیں کے ہزاروں گِلے ہوئے

سُکھ ملا جس کو زمانے میں مبارک ہو اُسے
ہم نے تو کچھ بھی نہ پایا غم و حسرت کے سوا
عکس دُنیا کے مرقع کا پڑا آنکھوں میں
اب اُٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا

نہ یہ رنگِ طبع ہوتا نہ یہ دل میں جوش ہوتا
یہ جنوں اگر نہ ہوتا تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غمِ دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا
مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا

موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آ گئی
نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا
بازارِ مغربی کی ہوا سے خدا بچائے
میں کیا، مہاجنوں کا دِوالا نکل گیا

کام کوئی مجھے باقی نہیں مرنے کے سوا
کچھ بھی کرنا نہیں اب کچھ بھی نہ کرنے کے سوا
حسرتوں کا بھی مری تم کبھی کرتے ہو خیال
تم کو کچھ اور بھی آتا ہے سنورنے کے سوا

اِس بحر میں ہوں مثلِ حباب اے غمِ ہستی
طوفاں مری کشتی کو ڈبو ہی نہیں سکتا

چھا گئی زردی چمن پر جلوۂ گُل ہو چکا
جورِ صرصر کے دن آئے دورِ بلبل ہو چکا
بحرِ عرفاں کے لیے ہے کشتیٔ دِل لازمی
سود منداس راہ میں الفاظ کا پل ہو چکا
سانس لینے میں بھی اے اکبرؔ کرو اب احتیاط
موقعِ فریاد و آہِ بے تامل ہو چکا

محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بے چارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اُچھل آیا

اشارہ ہے یہی بادِ صبا کا
چمن اک رنگ ہے اس کی ادا کا

نسیمِ صبح گاہی وجد میں ہے — عجب مطلب ہے بلبل کی صدا کا

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی — موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا
اس کی بیٹی نے اُٹھا رکھی ہے دنیا سر پہ — خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا
ضبط سے کام لیا دل نے تو کیا فخر کروں — اس میں کیا عشق کی عزت تھی کہ رسوا نہ ہوا
مجھ کو حیرت ہے یہ کس پیچ میں آیا زاہد — دامِ ہستی میں پھنسا زلف کا سودا نہ ہوا

حیا سے سر جھکا لینا اُدا سے مسکرا دینا — حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

دن کو بھی ان کے ملنے سے بہتر ہے احتراز — ملتے نہیں جو رات کو اپنے مکان پر
جو ہے زباں پہ دل کو نہیں اس سے فائدہ — جو دل میں ہے وہ لا نہیں سکتے زبان پر
شکرِ خدا کہ شرم کی تکلیف سے بچے — یاروں کی اب تو بھیڑ ہے مے کی دکان پر
افسانۂ بہار د زبانِ نسیم — واہ — گل جامہ چاک کرتے ہیں اس داستان پر

تہذیب کے خلاف ہے جو لائے راہ پر — اب شاعری وہ ہے جو ابھارے گناہ پر
کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول — یہ بات منحصر ہے تمہاری نگاہ پر

منہ دیکھتے ہیں حضرت احباب پی رہے ہیں — کیا شیخ اسی لیے اب دنیا میں جی رہے ہیں
میں نے کہا جو اس سے ٹھکرا کے چل نہ ظالم — حیرت میں آکے بولا کیا آپ جی رہے ہیں

احباب اُٹھ گئے سب اب کون ہم نشیں ہو
واقف نہیں ہیں جن سے باقی وہی رہے ہیں

عالم ہے بے خودی کا مے کی دوکان پر ہیں
ساقی پہ ہیں نگاہیں ہوش آسمان پر ہیں
اب تک ہے یاد ہم کو اپنی بلند نامی
اب بھی مٹے ہوئے ہم مٹتے نشان پر ہیں
شکر خدا کہ اُن کے قدموں پہ سر ہے اپنا
اس وقت کچھ نہ پوچھو ہم آسمان پر ہیں

مرحوم دل بھی کیا تھا کیا حسرتیں تھیں اس میں
اب تک کچھ اس کی باتیں میری زبان پر ہیں

ہم کب شریک ہوتے ہیں دنیا کی جنگ میں
وہ اپنے رنگ میں ہے ہم اپنی ترنگ میں
مفتوح ہو کے بھول گئے شیخ اپنی بحث
منطق شہید ہو گئی میدانِ جنگ میں

اس انقلاب پر جو میں روؤں تو ہے بجا
مجھ کو وطن میں اب کوئی پہچانتا نہیں
کس رُخ چلوں رسول تو دنیا سے اُٹھ گئے
اللہ ہے سو اس کو میں پہچانتا نہیں
میرے لیے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام
اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں
اکبر ہنوز ان سے ہے اُمیدوارِ لطف
بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا نہیں

حسن کے باب میں اکبر کی سند ٹھیک نہیں
یہ تو ہر اک بتِ کم سن کو پری کہتے ہیں

یارب ایسا کوئی بت خانہ عطا کر جس میں
ایسی گذرے کہ تصور بھی گنہگار نہ ہو
کیا وہ مستی کہ دمِ چند میں تکلیفِ خمار
مست وہ ہے کہ قیامت میں بھی ہشیار نہ ہو
ناز کہتا ہے کہ زیور سے ہو تزئینِ جمال
نازکی کہتی ہے سرمہ بھی کہیں بار نہ ہو
دلِ پُرداغ کو ارماں کہ گلے ان کو لگائے
ان کو یہ ڈر کہ گلے کا یہ کہیں ہار نہ ہو

ہنر سے بھی فوائد ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے
سبب یہ ہے کہ ہم آپس میں یک دل ہو نہیں سکتے

حکومت ایشیا پر قسمتِ مغرب میں ہے جب تک
کمالات اس کے جو ہیں ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے

تکلف انہیں کے لیے کیجیے
فقیروں کی کیا ہے جہاں پڑ رہے

بتوں سے بھی لڑتی نہیں یاں تو آنکھ
برہمن ہیں لندن تلک لڑ رہے

طلب ہے حق کی تو مل آ کے ہم سے مستوں سے
نہیں ہے میکدہ خالی خدا پرستوں سے

حلقے نہیں ہیں زلف کے حلقے ہیں جال کے
ہاں اے نگاہِ شوق ذرا دیکھ بھال کے

پہونچے ہیں تا کمر جو ترے گیسوے رسا
معنی یہ ہیں کمر بھی برابر ہے بال کے

بوس و کنار و وصلِ حسیناں ہے خوب شغل
کمتر بزرگ ہوں گے خلاف اس خیال کے

قامت سے تیرے صانعِ قدرت نے اے حسیں
دکھلا دیا ہے حشر کو سانچے میں ڈھال کے

میں شیفتہ ہوں آپ سے بے مثل حسیں کا
حیراں ہوں مرے کام سنور کیوں نہیں جاتے

جب کہتا ہوں مرتا ہوں مری جان میں تم پر
فرماتے ہیں مرتے ہو تو مر کیوں نہیں جاتے

وہ نیند میں ہیں شہر میں پھرنے لگے پہرے
پوچھے کوئی اکبرؔ سے یہ گھر کیوں نہیں جاتے

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکا تو نہیں مارا، چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ ہیں باتیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

اُس مے سے نہیں مطلب، دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے، دل ہی میں جو کھنچتی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو، یاں جی میں کہ سب سہہ لو
ان کا بھی عجب دل ہے، میرا بھی عجب دل ہے

سورج میں لگے دھبا فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

جلوۂ گل نے چمن میں مجھے بے چین کیا
مل ہی جاتے ہیں تری یاد دلانے والے
چشم بد دور جنوں کی ہے ترقی مجھ میں
کیوں نہ ہو مست ہیں خود ہوش میں لانے والے
آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے
تیغ قاتل نے یہ کیا اپنے دکھائے جوہر
سر بکف پھرتے ہیں اب جان چرانے والے

ذوق عرفاں جو نہ ہو بادہ پرستی اچھی
ہوش اگر دین سے غافل ہو تو مستی اچھی
بت جو مہنگے ہیں تو ہم یاد خدا کیوں نہ کریں
ہم غریبوں کو وہی شے جو ہے سستی اچھی
شیخ ہوں شہر میں اور کیمپ میں سید ہوں یہ کیا
جس میں مل جل کے رہیں سب وہی بستی اچھی

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی
نگاہ ناز بتاں پر نثار دل کو کیا
زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کر لی

ہو نہیں سکتا کبھی ہموار دنیا کا نشیب
اس گڑھے کو اپنی ہی مٹی سے بھرنا چاہیے

رہی نہ قلب میں قوت زمانہ سازی کی
دعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی
فلک نے ہم کو کیا منتخب مٹانے کو
ہمیں سے داد بھی چاہیں خوش امتیازی کی

چھڑا ہے راگ بھونرے کا ہوا کی ہے نئی دھن بھی
غضب ہے سال کے بارہ مہینوں میں یہ پھاگن بھی
یہ رنگ حسن گل یہ نغمۂ مستانۂ بلبل
اشارہ کرتی ہے فطرت ادھر آ دیکھ بھی سن بھی

بڑے درشن تمہارے ہو گئے، راجا کی سیوا سے
مگر من کا پنپنا چاہتے ہو تو کرو پن بھی

ایک صوتِ سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے
ورنہ ہر ذرہ ازل سے تا ابد خاموش ہے
مستیٔ نشو و نما ہے فصلِ گل کا جوش ہے
ہے ہوا میں فیضِ ساقی ہر کلی مے نوش ہے
بزم میں ایمائے چشمِ ساقیِ مے نوش ہے
وہ بہک جانے کے خطرے میں ہے جس کو ہوش ہے
شوقِ وصلِ شعلہ خوباں کیوں نہ ہو برسات میں
ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے
آئینے سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس
شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحبِ آغوش ہے

ناچ ہے مغرب کا بزمِ دہر میں
جھومتے ہیں مشرقی بیٹھے ہوئے
نام یوسف سے ہوا یعقوب کا
یوں تو حضرت کے بہت بیٹے ہوئے

جو کہا اس نے کیا منظور کیا حرفِ نفی ؟
ہم سرا پا اب تو اس محفل میں 'جی ہاں' ہو گئے
ہم تو انساں سے بنے جاتے ہیں بندر اے حضور
آپ خوش قسمت تھے بندر سے جو انساں ہو گئے

جاری طریقِ فضل و عطا سب کے ساتھ ہے
دیکھو جو غور سے تو خدا سب کے ساتھ ہے
بے حد رسا ہیں گیسوے دنیاے دوں کے پیچ
سب اس میں ہیں پھنسے یہ بلا سب کے ساتھ ہے
کم بخت دل کو کیوں ہے لگاوٹ انہیں کے ساتھ
ان کو تو شوقِ ناز و ادا سب کے ساتھ ہے

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے، بات اُن کی
انہیں کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے، رات اُن کی

سُنے جو اس کو اُسے تحیّر، جو اس کو برتے اُسے تردّد
ہماری نیکی اور ان کو برکت، عمل ہمارا نجات اُن کی

افسوس ہے گلشن کو خزاں لوٹ رہی ہے
شاخِ گلِ تر سوکھ کے اب ٹوٹ رہی ہے
اس قوم سے وہ عادتِ دیرینۂ طاعت
بالکل نہیں چھوٹی ہے مگر چھوٹ رہی ہے

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے
فنا اسی رنگ پر ہے قائم، فلک وہی چال چل رہا ہے
شکستہ و منتشر ہے وہ کل، جو آج سانچے میں ڈھل رہا ہے
یہ دیکھتے ہو جو کاسۂ سر، غرورِ غفلت سے کل تھا مملو
یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹّی میں گل رہا ہے
سمجھ ہو جس کی بلیغ، سمجھے۔ نظر ہو جس کی وسیع، دیکھے
ابھی یہاں خاک بھی اُڑے گی جہاں یہ قلزم اُبل رہا ہے
کہاں کا شرقی، کہاں کا غربی، تمام دُکھ سُکھ ہے یہ مساوی
یہاں بھی اک بامراد خوش ہے، وہاں بھی اک غم سے جل رہا ہے
عروجِ قومی زوالِ قومی، خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے
ہمیشہ ردّ و بدل کے اندر یہ امر پولیٹکل رہا ہے
مزہ ہے اسپیچ کا ڈنر میں، خبر یہ چھپتی ہے پانیر میں
فلک کی گردش کے ساتھ ہی ساتھ کام یاروں کا چل رہا ہے

گردن رفارمر کی ہر اک سمت تن گئی
بگڑی ہو قوم و ملک کی اُن کی تو بن گئی
لڑکے نئے طریق کی جانب جو کھنچ گئے
بوڑھوں کی آہ جانب چرخِ کہن گئی

دُنیا میں بھی مستِ اثرِ نغمۂ کُن ہے
پردیس میں ہے روح مگر دیس کی دُھن ہے
کی میں نے لگاوٹ تو بُتِ شوخ یہ بولا
کیوں کفر ہے بدنام جب ان میں بھی یہ گُن ہے
ہنس دیتے ہیں بُت سن کے یہ اکبرؔ کا وظیفہ
جب آپ کے درشن ہوں تو پھر پاپ بھی پُن ہے

دن رات کی یہ بے چینی ہے، یہ آٹھ پہر کا رونا ہے
آثار بُرے ہیں فرقت میں، معلوم نہیں کیا ہونا ہے
ترکیب و تکلّف لاکھ کرو فطرت نہیں چھپتی اے اکبرؔ
جو مٹّی ہے وہ مٹّی ہے، جو سونا ہے وہ سونا ہے

تجھے اُن سے ہے سرِ دوستی، تری آرزو بھی عجیب ہے
وہ ہیں تخت پر تو ہے خاک پر، وہ امیر ہیں تو غریب ہے
پئے حفظِ جاں ہیں جو گوشہ نشیں، وہ اجل کے ساتھ ہیں سازشیں
اور اسی روش پہ ہیں خواہشیں، یہ معاملہ بھی عجیب ہے
ترا جلوہ زیبِ خیال ہے، وہی وجد ہے، وہی حال ہے
تری انجمن سے ہوں دور اگر، مرا دل تو مجھ سے قریب ہے

کیا ہے مذہب، ایک ملکی اور سوشل انتظام
یہ نہیں پہچان ہرگز کافر و دیں دار کی
صورت و الفاظ کا اکثر نہیں ہے اعتبار
ہیں فقط یہ عادتیں رفتار کی گفتار کی
ہیں ہر اک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیں دار بھی
یاد رکھ تو بات یہ اک محرمِ اسرار کی

گونجی بہت ہے اس میں فریاد بیکسوں کی — ٹکڑے اُڑیں گے ایک دن اس گنبدِ کہن کے
غربت میں عمر گذری، نام و نشاں نہ پوچھو — نقشے بھی ذہن میں اب باقی نہیں وطن کے
زخموں سے چور ہیں ہم، اس کا خیال کس کو — چرچے ہیں ہر طرف بس تیرے ہی بانکپن کے
مغرب کا وعظ ادھر بھی اے پیرِ ملتِ نو — اس شہر میں بھی مردے محتاج ہیں کفن کے

نہیں سائنس واقف کارِ دیں سے — خدا باہر ہے حدِّ دوربیں سے
مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت — کبوتر اُڑ گئے انجن کی پیں سے
بساطِ حلقۂ میونسپل دیکھ — تجھے کیا کام ہے جاپان چیں سے

نہیں ملنے کا لطف اس قومِ بے تقوی و بے حس سے — مگر یہ بھی تو مشکل ہے کہ پھر آخر ملیں کس سے
سنورنے کے سوا یہ بے بصیرت کرتے ہی کیا ہیں — چمن کی کیا حفاظت ہو رہی ہے چشمِ نرگس سے
بت کا تو عنصر ہی نہیں ان کی طبیعت میں — لگاوٹ ہے فقط وہ بھی کبھی اُس سے کبھی اِس سے

اسی میداں میں ہوا تشنہ لبی سے میں ہلاک — اسی میدان کے آغوش میں ایک نہر بھی ہے
کیمپ ہی میں نظر آتی ہے اُنھیں قوتِ قوم
ورنہ بسنے کو دیہات بھی ہے شہر بھی ہے

زخمی نہ ہوا تھا دل ایسا، سینے میں کھٹک دن رات نہ تھی
پہلے بھی ہوئے تھے کچھ صدمے، روئے تھے مگر یہ بات نہ تھی
اب نشو و نما کا وقت نہیں، اب عمر نہیں اُمیدوں کی
دُنیا سے لگاوٹ کیا میں کروں، قوت ہی نہیں تمہیدوں کی

تفریح و سفر کا شوق نہیں، دہلی ہے نہ اب کلکتہ ہے
عشرت کے لیے کافی ہے دعاؔ ہاشم کا خیال البتہ ہے

آپ سے بے حد محبّت ہے مجھے
آپ کیوں چپ ہیں یہ حیرت ہے مجھے
شاعری میرے لیے آساں نہیں
جھوٹ سے واللہ نفرت ہے مجھے
زورِ رندی ہے نصیبِ دیگراں
شاعری کی صرف قوت ہے مجھے

نغمۂ یورپ سے میں واقف نہیں
دیس ہی کی یاد ہے بس گت مجھے
دے دیا میں نے بلا شرط ان کو دل
مل رہے گی کچھ نہ کچھ قیمت مجھے

قبل از غرور و ناز حکومت کی فکر کر
فرعونیت کے واسطے سامان چاہیے
میں نے جو اس کو پیش کیا اس کے سامنے
کہنے لگا وہ شوخ، مجھے جان چاہیے
پنڈت کو بھی سلام ہے اور مولوی کو بھی
مذہب نہ چاہیے مجھے ایمان چاہیے

رنگِ شراب سے مری نیت بدل گئی
واعظ کی بات رہ گئی ساقی کی چل گئی
تیار تھے نماز پہ ہم سُن کے ذکرِ حور
جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی
مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیّاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کہ کس پر کیا گزرتی ہے
نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گل کھلانے کو
یہی ذرّے ابھرتے ہیں یہی مٹی سنورتی ہے
زبانیں مختلف بھی ہوں اگر دو حق پرستوں کی
بہم نبھ جاتی ہے نیت کی خوبی کام کرتی ہے

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
شدتِ یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا
آپ تصنیفِ شرائط کی نہ تکلیف کریں
مجھ کو خود ولولۂ عرضِ تمنا نہ رہا
اس کی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے
عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا

غم کیا جو آسمان ہے مجھ سے پھرا ہوا
میری نظر سے خود ہے زمانہ گرا ہوا
مغرب نے خوردبیں سے کمر اُن دیکھ لی
مشرق کی شاعری کا مزہ کرکرا ہوا

جہانِ فانی کی حالتوں پر بہت توجہ عبث ہے اکبرؔ
جو ہو چکا ہے وہ پھر نہ ہوگا جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا
خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب اُس کو نہیں آتا، انھیں غصا نہیں آتا

میں کیا کہوں اُسے اور کیا کروں گلا اُس کا
مجھے ہنوز پتا ہی نہیں ملا اُس کا
اگرچہ دل کو ہے سودا اُسے بُرا نہ کہو
کسی کی زلف سے ملتا ہے سلسلا اس کا

غریب اکبرؔ نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب اُلٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کر ہی لے گا مرا مُوا کیا

رہا تو مُردوں سے حال بدتر جیا بھی اکبرؔ تو وہ جیا کیا
نئے طریقوں کے حامیوں نے کہا بہت کچھ مگر کیا کیا
یہ چاہے ہرگز نہیں ہے کافی نہیں ہے لِم ٹِنڈ کا بندہ قائل
شراب ہی حلق سے نہ اُتری تو شیخ صاحب نے پھر کیا کیا

بہت دشوار ہے شایستۂ راہِ طلب ہونا
نظر کا حد میں رہنا شوقِ دل کا باادب ہونا

کونسلوں میں سوال کرنے لگے
قومی طاقت نے جب جواب دیا

آنے دو مصیبت کو ذرا خانۂ دل پر
جو بند ہے غفلت میں وہ عبرت میں کھُلے گا
محفل ہی میں خاموش ہے اور بند ہے اکبرؔ
تنہا کبھی ملیے گا تو خلوت میں کھُلے گا
کیا علم کی لذّت سے بھی بڑھ کر ہے کوئی چیز
یہ حال تو بس محفلِ حیرت میں کھُلے گا

کیا خبر کون سا قانون سزا دے گا مجھے
مجھ پہ الزام ہے مذہب کی طرفداری کا
مال گاڑی پہ بھروسا ہے جنھیں اے اکبرؔ
اُن کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا

اِدھر تسبیح کی گردش میں پایا شیخ صاحب کو
برہمن کو اُدھر اُلجھا ہوا زنّار میں دیکھا
مگر عشقِ حقیقی کا کوئی رشتہ نہ تھا دل میں
فقط نفسانیت کا پیچ وخم ہر تار میں دیکھا
وہ بانکا قاتل آئینے کی کچھ پروا نہیں کرتا
کبھی دیکھا بھی اپنا عکس اگر تلوار میں دیکھا

ایک دن اور قیامت کھسک آئے گی اِدھر
اور کیا عرض کروں آپ سے کل کیا ہوگا

خوشی تو ایسی کوئی نہ دیکھی، کہ اس کی مستی زیادہ رہتی
مگر غم ایسا ہوا مجھے اب، کہ حشر تک ہوش میں رہوں گا

معنیٰ کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں
وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

میں کب کہتا ہوں اے واعظ کہ میں نے رازِ دیں سمجھا
فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

آپ کے درشن مصوّر کے بھی حصّے میں نہیں
بس لیا جاتا ہے فوٹو ہی سے فوٹو آپ کا

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض
سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا
بہرِ خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع
صاحب کا کیا جواب تھا بابو نے کیا کہا

دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن
کٹ گئی عمر امیدوں ہی میں کچھ بھی نہ ہوا

کچھ نہیں کارِ فلک حادثہ پاشی کے سوا
فلسفہ کچھ نہیں الفاظ تراشی کے سوا
لکھو لائف مری ایّامِ جوانی کے سوا
سب بتا دوں گا تمہیں "انتردوانی" کے سوا

خیر اُن کو کچھ نہ آئے پھانس لینے کے سوا
مجھ کو اب کرنا ہی کیا ہے سانس لینے کے سوا
تھی شبِ تاریک، چور آئے جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

بالائے عرش ہیں کہ تہِ آسماں ہیں آپ
دعوے سے قبل دیکھ تو لیجیے کہاں ہیں آپ

یوں تو ہر شے پہ اداسی سی نظر آتی ہے
کس مپرسی میں کوئی شے نہیں مذہب کی طرح

بہت مشکل ہے نو عمروں کا بچنا اس کے عشووں سے
نئی آنکھوں کے آگے آتی ہے دنیا نئی ہو کر

تمہارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیونکر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرت آدمؑ بنے کیونکر

مبتلائے بحث کو رازِ خدا کی کیا خبر
معنی بے لفظ و لفظِ بے صدا کی کیا خبر
پا یا اک ہنگامہ ہم بھی ہو گئے اس میں شریک
ابتدا کا علم کیسا انتہا کی کیا خبر

مسجد نے کہا میرا فسانا بھی ہے اک چیز
کالج نے پکارا کہ زمانہ بھی ہے اک چیز
واعظ کی بلاغت بھی بڑی چیز ہے لیکن
سچ بات یہ ہے دل میں سمانا بھی ہے اک چیز

جیسی حالت پیش آتی ہے زمانے میں جسے
ذہنِ انسانی میں ویسا ہی اتر آتا ہے عکس
یہ مواقع ہیں کہ ہو جاتے ہیں وجہِ اختلاف
آئینے کا رُخ جہاں بدلا بدل جاتا ہے عکس

یہ شاعر رنگِ شب کو گیسوئے لیلا بھی کہتے ہیں
یہی حسنِ تصوّر ہے جسے سودا بھی کہتے ہیں
بتوں کے ناز پر اس عہد میں لازم ہے خاموشی
بُرا کہتے ہیں دس ان کو تو دس اچھا بھی کہتے ہیں

جہاں سوئی گھڑی کی ہوتی تھی وقت اس کو کہتے تھے
گئی چوری تو ہم سمجھے زمانہ اس کو کہتے ہیں

نہیں ہے گو مرے پائے ثبات کو لغزش
ہوائے دہر سے میں دم بدم پگھلتا ہوں

بسانِ شمع فروغ اپنا ہے ہر اک پہ عیاں
مگر مجھی کو فقط ہے یہ حس کہ جلتا ہوں

شیخ جی بھی وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں
اب تو ہم مصلحتاً ان کا ادب کرتے ہیں
طلب جاہ پہ وہ کرتے ہیں کس کو مجبور
سچ تو یہ ہے کہ ہمیں لوگ غضب کرتے ہیں

بوئے شگفتگی ہے، مگر بات کی نہیں
خواہش مجھے اب اُن سے ملاقات کی نہیں
میرے سکوت سے مجھے بے حس نہ جانیے
الفاظ کی کمی ہے، خیالات کی نہیں
اس کے سوا کہ شکر کا موقع نہیں ملا
مجھ کو شکایت ان سے کسی بات کی نہیں

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں
بے حد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں

تارِ برقی سے ہوا معلوم حالِ زارِ روس
شور برپا ہے کلیسا میں، حرم میں، دَیر میں
آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد
لیکن اُڑ جاتی ہیں ساری عظمتیں دو فیر میں

ترقی کی تماشا گاہ میں اس وقت اے اکبر
وہ منظر ہیں کہ مجھ کو ہوش سے بیزار کرتے ہیں

خدا شناس تو ہونا نہیں ہے سہل اکبر
یہی بہت ہے جو دنیا شناس ہو جاؤں

مقبول جو ہوں شاذ ہیں قابل تو بہت ہیں
آئینے کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنھیں ملتی ہے لذت ــــ یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

شکم ہوتا تو میں اس عہد میں پھولا ہوا رہتا ــــ سراپا دل بنا ہوں اس سبب کشتۂ غم ہوں

نہ واعظ کی کوئی سنتا، نہ پڑھتا ہے مصنف کی ــــ زباں بکتی ہی رہتی ہے قلم چلتے ہی رہتے ہیں
جو تھک کر بیٹھ جاتا ہوں، زمیں کہتی ہے یہ مجھ سے ــــ ترے رکنے سے کیا ہوتا ہے، ہم چلتے ہی رہتے ہیں

اس بزم میں مجھ سے کہتے ہیں سب، موقع کے مطابق بات کہو
اور ہم نے یہ دل میں ٹھانی ہے یا دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں

بنگلوں ہی کی چھتوں پہ کریں شاعر اب نگاہ ــــ دورِ جدید میں کوئی شے آسماں نہیں

جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں ــــ مارچ میں بلبل ہوں جولائی میں پروانہ ہوں

چال دنیا کی تمہیں محسوس ہو دشوار ہے ــــ یہ زمیں چلتی ہے تیزی سے مگر ہلتی نہیں

اس کی باتوں سے سمجھ رکھا ہے تم نے اُسے خضر ــــ اس کے پاؤں کو تو دیکھو کہ کدھر جاتے ہیں

یہ کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ پڑے رہو ــــ کہتا ہے اب یہ چرخ کہ کھاؤ پڑے رہو
اے شیخ ہم ہیں خوش جو رہو تم ہمارے پاس ــــ مشکل ہے یہ مگر کہ کہیں بے لڑے رہو
ممتاز راستی سے ہوئے ہیں چمن میں سرو ــــ یہ بھی مگر ہے حکم کہ یونہی کھڑے رہو

ہوں میں پروانہ مگر شمع تو ہو رات تو ہو — جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو
دل بھی حاضر، سرِ تسلیم بھی خم کو موجود — کوئی مرکز ہو کوئی قبلۂ حاجات تو ہو
دل تو بے چین ہے اظہارِ ارادت کے لیے — کسی جانب سے کچھ اظہارِ کرامات تو ہو
دلکشا بادۂ صافی کا کسے ذوق نہیں — باطن افروز کوئی پیرِ خرابات تو ہو
گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصہ لیکن — کس سے کہیے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو
داستانِ غمِ دل کون کہے کون سُنے — بزم میں موقعِ اظہارِ خیالات تو ہو
وعدے بھی یاد دلاتے ہیں گلے بھی ہیں بہت — وہ دکھائی بھی تو دیں اُن سے ملاقات تو ہو
کوئی واعظ نہیں فطرت سے بلاغت میں سوا — مگر انسان میں کچھ فہمِ اشارات تو ہو

جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر — ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے
عام الزام ہے اکبر یہ کہ پیتا ہے کیوں — اس کی پرسش نہیں ہوتی کہ یہ کھاتا کیا ہے

انسان نے انسان سے کی جنگ ہمیشہ — دنیا کے نظر آئے یہی رنگ ہمیشہ

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ — ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ
اس زمانے میں غیرتِ ملت — رہتی ہے جان کی امان کے ساتھ

کیا ہے جس نے اس عالم کو پیدا اس کو کیا کہیے — خرد خاموش ہے اور دل یہ کہتا ہے خدا کہیے
اسی حیرت میں عمریں کٹ گئیں اربابِ بینش کی — کسے اللہ کہیے اور کس کو ما سوا کہیے
سرافرازی ہو اڈنوں کی تو گردن کاٹیے ان کی — اگر بندر کی بن آئے تو نہیں ارتقا کہیے
یہ ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے — مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دعا کہیے

دل میں خاک اڑتی ہے خالی لہجہ ولب دیکھیے
مذہب اب رخصت ہے بس تاریخ مذہب دیکھیے

وہی نگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو
غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

تاکیدِ عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے
پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا
سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے

دنیا یوں ہی ناشادیوں میں شاد رہے گی
برباد کیے جائے گی آباد رہے گی
گلچیں کا ستم بھول بھی جاؤں کبھی شاید
صیاد کی بیداد مگر یاد رہے گی
نالے رستم افزا ہیں تو روکوں گا زباں کو
دل ہی میں نہاں اب مری فریاد رہے گی

مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں
یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

سینے میں دلِ آگاہ جو ہو کچھ غم نہ کرو ناشاد سہی
بیدار تو ہے مشغول تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی
ہر چند بگولا مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بے چین سہی برباد سہی
وہ خوش کہ کروں گا ذبح اسے یا قیدِ قفس میں رکھوں گا
میں خوش کہ یہ طالب تو ہے مرا صیاد سہی جلاد سہی

میں تو ہمدرد ہوں بس اُن کی گرفتاری کا
قیدِ ہستی سے جو مشتاق ہیں آزادی کے
ڈھونڈنا چاہیے تھا اکبرِ بے کس کو وہاں
ایک ویرانہ بھی ہے متصل آبادی کے

آنکھوں میں اُتر آتے ہیں موہوم کے نقشے
دل میں یہ سمائی ہے کہ موجود وہی ہے

رہِ اصلاح میں گو تیز گامی خوب ہے لیکن
قدم کو لغزشیں جب ہوں ٹھہر جانا ہی بہتر ہے
مواقع دیکھ کر اظہارِ مردمی چاہیے اے دل
ڈرائیں کھیل میں بچے تو ڈر جانا ہی بہتر ہے
بلاتا ہے مجھے بُت خانے سے شیخِ حرم اکبر
نہ جانا گو کہ جائز ہے مگر جانا ہی بہتر ہے

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لیے دشوار ہے

سودا بھی ہے رنگِ طبعِ بشر فطرت ہی میں ہیں اسبابِ جنوں
اکبر کو بھی ہوش آجائے تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

تہذیبِ نو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر
دُنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو
کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گذر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردّد
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

زندگی بے لُطف ہے دشوار ہے
سانس لینا اب مجھے بیگار ہے

لیا ہم نے بوسۂ رُخ تو نہ بدگماں ہو اے جاں
کوئی پھول دیکھ لیتے تو اُسے بھی پیار کرتے

حادثے اپنے طریقوں سے گزرتے ہی رہے
کیوں ہُوا ایسا یہ ہم تحقیق کرتے ہی رہے
صفحۂ ہستی پر آخر کس قلم کی ہے کشش
نقش مٹتے ہی رہے لیکن اُبھرتے ہی رہے

انتظار آخر اجل سے کر گیا یاں ہم کنار — چشمِ بد دُور آپ اپنے گھر سنورتے ہی رہے

زندگی سے میرا بھائی سیر ہے — پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہے

جنونِ عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے — یہی مستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے
یہ سچ ہے بے خبر ہے نصف دُنیا نصف دُنیا سے — کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے
بیاں اپنے اثر میں حس کی قوت لا نہیں سکتا — زبانیں کہہ نہیں سکتیں دلوں پر جو گزرتی ہے
وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دیں ہیں اے اکبرؔ — کہ اُمید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

بدلی ہوئی رُت محسوس ہوئی بھونرے کی ابھی آواز سُنی
فطرت کی بسنتی یہ ٹھمری بیساختہ دبے ساز سُنی

دل نہ مایوسی پہ مائل ہے نہ محوِ ناز ہے — منزلِ ہستی میں ہر انجام اک آغاز ہے

تیرے مجنوں کے بیاباں کا ہے عالم دوسرا — جو بگولا ہے وہ اک ناقہ کسی محمل کا ہے
ذرہ ذرہ ہے طریقِ عشقِ حق میں دل نواز — ہر قدم پر سالکِ رہ کو گماں منزل کا ہے
بحرِ ہستی خود حدوں سے اپنی ہے نا آشنا — ایک تلاطم ہے بپا کس کو پتا ساحل کا ہے
یہ نظر کی ناتوانی یہ بتوں کی زینتیں — کیا کہوں اکبرؔ بس اب اللہ مالک دل کا ہے

میں چاہتا ہوں کہ بس ایک ہی خیال رہے — مگر خیال سے پیدا خیال ہوتا ہے
وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں — وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

سوسائٹی سے الگ ہو تو زندگی دشوار — اگر ملو تو نتیجہ ملال ہوتا ہے

خموش شمع صفت کیوں نہ ہو زباں میری — کہ خود ہی بزم میں روشن ہے داستاں میری
اگرچہ عقل سے کرتا ہوں میں حفاظتِ جاں — مگر نہ عقل مرے بس کی ہے، نہ جاں میری

جو میری ہستی تھی مٹ چکی ہے، نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ اُن کا، دماغ میرا، خیال ان کا، زبان میری

چھیڑنا اچھا ہے سازِ سعی کا اس بزم میں — آدمی کو زندگی میں اک نہ اک دُھن چاہیے
ہو دسمبر میں مبارک یہ اچھل کود آپ کو — خون مجھ میں بھی ہے لیکن مجھ کو پھاگن چاہیے

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی — شاید، نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

ہنسنا بھی یہاں ہے، رونا بھی، دلکش بھی ہے دُنیا فانی بھی
جینا بھی ہے اور آبادی بھی، مرنا بھی ہے اور ویرانی بھی
اللہ ہی ہے ان لڑکیوں کا، فر فر بھی بنیں حد میں بھی رہیں
ہے کورس بھی ان کا اسکیمی اور پاس شدہ اُستانی بھی

شگفتہ کس قدر ربیلا ہے کتنی مست جوہی ہے — ترا ہی رنگ ہے گلشن میں خوشبوؤں میں تو ہی ہے
دل اپنا دوست ہو کر جب دکھاتا ہے غلط راہیں
تو ان کی آنکھ کو میں کیا کہوں وہ تو عدو ہی ہے

دل تو ہے پاس مرے عقل پہ قابو نہ سہی　　شہرتِ قیس تو حاصل ہے ارسطو نہ سہی

اسلام کے دعوے سے میں باز آتا ہوں صاحب　　یہ کون بتائے تمہیں اللہ کہاں ہے
سروس میں میں داخل نہیں، ہوں قوم کا خادم　　چندوں کی فقط آس ہے تنخواہ کہاں ہے

آپ کے عارض کے آگے کیا جمے گا اس کا رنگ　　گل جو گلشن میں سنورتا ہے سنورنے دیجیے
ہو چکا بسمل، کہاں تک آفریں ہر وار پر　　واہ کی طاقت نہیں اب مجھ کو مرنے دیجیے

ٹپکتے ہیں وہ مضمونِ جنوں زا میرے خامے سے　　کہ اکثر ہوش ہو جاتا ہے باہر اپنے جامے سے

نہ تعلق ہے کسی سے نہ شناسائی ہے　　انجمن میں ہوں مگر عالمِ تنہائی ہے
محوِ حیرت وہ ہے اس پر ہے خموشی کی بہار　　آنکھ نرگس کی ہے سوسن نے زباں پائی ہے
طلبِ عشق کا ایک جوش ہے فطرت سے عیاں　　جس طرف دیکھیے طوفانِ خود آرائی ہے

بے حواسی میں میں کچھ سمجھا نہیں اے ہم نشیں　　کیا دلِ پُر غم مرا تڑپا تھا یہ بجلی نہ تھی؟
فلسفی کی بات بھی میں نے سُنی واعظ کی بھی　　جانبِ حق رہ نما وہ بھی نہ تھی یہ بھی نہ تھی

مٹ گئے ہیں مگر اک نقش ابھی باقی ہے　　آنکھ مایوس ہے شوریدہ سری باقی ہے
آنکھ سے نور گیا دل سے گیا صبر و قرار　　جان بھی جسم سے رخصت ہو یہی باقی ہے
ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر
قیدِ ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

ہند میں تو مذہبی حالت ہے اب ناگفتہ بہ — مولوی کی مولوی سے روبکاری ہوگئی
اک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جان — خدمتِ قومی میں بارے جاں نثاری ہوگئی
اپنے سیلانِ طبیعت پر جو کی میں نے نظر — آپ ہی اپنی مجھے بے اعتباری ہوگئی
نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہوگئی — لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہوگئی

جماعت منتشر ہو، فطرتی مجلس تو باقی ہے — زبانیں بند کردو، دل کے اندر حس تو باقی ہے
اسی کا رنگِ حیرت دیکھ کر بہلائیں گے دل کو — چمن سے گل اگر رخصت ہوا نرگس تو باقی ہے
یہ مصرع قافیے ہی کے لیے ہے خوب اے اکبرؔ — جو اُجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں پیرس تو باقی ہے

قومی ترقیوں کی زنانے میں دھوم ہے — مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

تیزیاں کرتے ہیں قانون بدلنے والے — زحمتیں سہتے ہیں قانون پہ چلنے والے

اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہم کو لوگ — اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اس قدر جانے گئے
بولے چپراسی جو میں پہنچا بہ امیدِ سلام — پھانکیے خاک آپ بھی صاحب ہوا کھانے گئے
مجھ میں اظہارِ محبت ان میں اظہارِ کمال — میں وہاں رونے گیا اور وہ کہیں گانے گئے

لیڈروں کی دھوم ہے اور فالور کوئی نہیں — سب تو جنرل ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

تھے معزز شخص لیکن اُن کی لاف کیا لکھوں
گفتنی درجِ گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

متفرقات

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا
چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر
اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

رسوا وہ ہوا جو مستِ پیمانہ ہوا
لپکا جو سایہ پردہ دیوانہ ہوا
انگلینڈ سے اپنا دل جو لایا نہ درست
محروم اُدھر، اِدھر سے بیگانہ ہوا

مجلس میں خیالِ بادہ نوشی پایا
مکتب میں سرِ سخن فروشی پایا
مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبرؔ
لیکن اک عالمِ خموشی پایا

کامل کم ہیں اور اہلِ ارشاد بہت
ساحر کم ہیں ملیں گے صیاد بہت
ہے بزمِ سخن کا حال یہ اے اکبرؔ
شاعر کم ہیں مگر ہیں اُستاد بہت

تحریکِ ضرورتِ معیشت ہے بہت
خرقہ کو بھی اب خیالِ خلعت ہے بہت
خالق کے جمال کا تو سودا کم ہے
اللہ کے نام کی تجارت ہے بہت

مشکل سے یہ حالتیں سہی جاتی ہیں
پھانسیں ہیں کہ قلب میں رہی جاتی ہیں
تفصیل نہ پوچھ ہیں اشارے کافی
یوں ہیں یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اُڑ جائے گی بھاپ
دیکھنا اکبرؔ بچائے رکھنا اپنے آپ کو

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بُری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبرؔ
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے　　بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی　　یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

جلوۂ دربار دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا　　دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا　　کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا　　اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا　　حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے　　گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے　　بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اک جنگل دیکھا　　اس جنگل میں منگل دیکھا
برہما اور ورنگل دیکھا　　عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری　　پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری　　تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

ڈالی میں نارنگی دیکھی　　محفل میں سارنگی دیکھی
بیرنگی بارنگی دیکھی　　دہر کی رنگا رنگی دیکھی

اچھے اچھوں کو جھٹکا دیکھا بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
مُنہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زرّیں جھولیں نور کا عالم میلوں تک وہ چم چم چم چم

پُر تھا پہلوئے مسجدِ جامع روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کِسی کا سامع سب کے سب تھے دید کے طامع

سُرخی سڑک پر کٹتی دیکھی سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی لُطف کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اِک چوکھی دیکھی خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حِصّہ من و سلوا ایک کا حِصّہ تھوڑا حلوا
ایک کا حِصّہ بھیڑ اور بلوا میرا حِصّہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا رُخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر — تحت میں ان کے بیسوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر — اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوجِ بخت ملاقی ان کا — چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل ان کی ساقی ان کا — آنکھیں میری باقی اُن کا

ہم تو ان کے خیر طلب ہیں — ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
اُن کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں — سب سامانِ عیش و طرب ہیں

اِگزبِشن[۱] کی شان انوکھی — ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی — من بھر سونے کی لاگت سوکھی

جشنِ عظیم اس سال ہوا ہے — شاہی فورٹ میں بالؔ[۲] ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے — قصۂ ماضی حال ہوا ہے

ہے مشہورِ کوچہ و برزن — بال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائرِ ہوش تھے سب کے پَر زن — رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن

ہال میں چمکیں آ کے یکایک — زرّیں تھی پوشاک جھکا جھک
محو تھا ان کا اوجِ سماں تک — چرخ پہ زہرہ ان کی تھی گاہک

---

۱ exhibition

۲ ball مغربی رقص

گو رقاصۂ اوجِ فلک تھی
اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اِندر کی محفل کی جھلک تھی
بزمِ عشرت صبح تلک تھی

کی ہے یہ بندش ذہنِ رسانے
کوئی مانے خواہ نہ مانے
سُنتے ہیں ہم تو یہ افسانے
جس نے دیکھا ہو وہ جانے

سیّد سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جا بجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جنابِ رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر
بندہ بنا دیا ہے تجھے حُبِّ جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر
کیا جانیے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر
گذرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
وہ آب و تاب و شوکتِ ایوانِ خسروی
وہ محکموں کی شان، وہ جلوہ سپاہ کا
آئے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی
جس سے خجل ہو نورِ رُخِ مہر و ماہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی
کمسن مِسوں سے ذکر ہو الفت کا، چاہ کا
نوخیز، دل فریب، گل اندام، نازنیں
عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رُکیے اگر تو ہنس کے کہے اک بُتِ حسیں
"دِل! مولوی، یہ بات نہیں ہے گناہ کا"
اُس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام
پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دُھن بندھے
سودا جناب کو بھی ہو ٹڑکی کُلاہ کا
منبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشہ میں اے جناب
سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

برقِ کلیسا

رات اُس مِس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حُسن، وہ شوخی، وہ نزاکت، وہ اُبھار

زُلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ مَلک پیار کریں

گرم تقریر جسے سُننے کو شعلہ لپکے
دل کش آواز کہ سُن کر جسے بلبل جھپکے

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حُسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لُطفِ تبسم سے گرانے والی

پہلوے حُسنِ بیاں شوخیِ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا، دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یا حفیظ کا کیا وِرد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزّت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں مَیں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میدان میں تو اِترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق ورفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اُڑ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحث بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

انگلش ڈرس انور کا جو کل بزم میں دیکھا
اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر
تبدیلِ صورت کے رہے گر یہی اطوار

خالق کی عبادت سے حجاب آنے لگے گا
شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار

بیگانہ وشی ہوگی عزیزانِ وطن سے
بنگلے میں نہاں ہو گے کہیں چھوڑ کے گھر بار

فاتح سے مساوات کی اُٹھیں گی اُمنگیں
وہ زیست جو آسان تھی ہو جائے گی دشوار

آپس میں بھی تم لوگ موافق نہ رہو گے
ایک ایک کو دیکھے گا بہ اکراہ و بہ انکار

آخر کو رہو گے نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے
انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بےزار

انور نے کہا صَلِّ علیٰ واہ بہت خوب
شک اس میں نہیں مدح کے قابل ہے یہ گفتار

لیکن جو یہ تعمیم ہے حضرت کے سخن میں
اس کو تو نہ تسلیم کرے گا یہ گنہ گار

ہر مذہب و ملّت میں ہیں اچھے بھی بُرے بھی
وہ کونسا فرقہ ہے کہ سب جس میں ہوں ابرار

ملبوس و مکاں کا جو کیا آپ نے مذکور
اس کے بھی بجا ہونے کا مجھ کو نہیں اقرار

باطن سے ہے اخلاقِ حمیدہ کا تعلق
فطرت میں جو ہے نیک وہ بد ہوگا نہ زنہار

اوضاعِ زمانہ تو بدلتے ہی رہیں گے
رُکتی نظر آتی نہیں دنیا کی یہ رفتار

ہے جس کو ضرورت وہ ضرورت سے ہے مجبور
ہے شوق جسے کیوں نہ کیا جائے وہ مختار

مقصود جو اصلی ہے وہ ہے دل کی درستی
یا ہیٹ اور کوٹ ہو یا جبّہ و دستار

شبہ مرے اس قول کی صحت میں اگر ہو
سُن لیجیے سعدی کا یہ ارشاد گہربار

حاجت بہ کلاہِ برکی داشتنت نیست
درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار

قطعہ

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ
مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے میں نے جس کو زیبِ قرطاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم۔اے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق، کجا کالج کی بکواس

کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغزِ سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفا مرا باحسرت و یاس

اک مِس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسلِ قوم
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قومِ انگلش سے ملو سیکھو وہی وضعِ تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ و کاری[ل] کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے دیکھو اُن کے انداز و طریق
ہال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو اُن سے تاش

بادۂ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خُم کے خُم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

اِس کی چتون سحر آگیں اُس کی باتیں دل رُبا
چال اُس کی فتنہ خیز اِس کی نگاہیں برق پاش

وہ فروغِ آتشِ رُخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیشِ شمع پروانے کی لاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برقِ بلا
دستِ سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش؟

دونوں جانب تھا رگوں میں جوششِ خونِ فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

بار بار آتا ہے اکبرؔ میرے دل میں یہ خیال
حضرتِ سیّد سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک
بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

میاں سے بی بی ہیں، پردہ ہے اُن کو فرض مگر
میاں کا علم ہی اُٹھا تو پھر میاں کب تک

ل curry

طبیعتوں کا نمو ہے ہوائے مغرب میں — یہ غیرتیں، یہ حرارت، یہ گرمیاں کبتک
عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ و انٹر میں — سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کبتک
جو منہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مُصر ابلیس — چھپیں گی حضرتِ حوّا کی بیٹیاں کبتک
جنابِ حضرتِ اکبر ہیں حامیِ پردہ
مگر وہ کب تک اور اُن کی رُباعیاں کبتک

پوچھا پروانہ سے کہ اے ناداں — آگ میں گر کے کیوں گنواتا ہے جاں
جل کے بولا کہ اے خرد دشمن — سُن لے مجھ سے یہ معنیِ روشن
شعلے سے طالبِ وصال اچھا — یا اندھیرے میں پایمال اچھا؟

ہستی کے شجر میں جو یہ چاہو کہ چمک جاؤ — کچّے نہ رہو بلکہ کسی رنگ میں پک جاؤ
میں نے کہا قائل میں تصوف کا نہیں ہوں — کہنے لگے اِس بزم میں آؤ تو تھرک جاؤ
میں نے کہا کچھ خوف کلکٹر کا نہیں ہے — کہنے لگے آجائیں ابھی وہ تو دبک جاؤ
میں نے کہا ورزش کی کوئی حد بھی ہے آخر — کہنے لگے بس اس کی یہی حد ہے کہ تھک جاؤ
میں نے کہا افکار سے پیچھا نہیں چھٹتا — کہنے لگے تم جانبِ مے خانہ لپک جاؤ
میں نے کہا اکبر میں کوئی رنگ نہیں ہے
کہنے لگے شعر اُس کے جو سُن لو تو پھڑک جاؤ

بلبل ہیں آج ہم چمنستانِ کمپ کے — پروانہ کل بنیں گے کلیسا کے لمپ کے
فکرِ بہشت و کوثر و تسنیم ہو چکی — اب پارک کا خیال ہے چرچے ہیں پمپ کے
رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک پھونک کر — خوگر ہوئے ہیں لیپ[1] کے اسکپ[1] کے جمپ[1] کے

---

[1] leap, skip, jump

کرزن سبھا

سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے — گلوں میں غیرتِ گلشن کی آمد آمد ہے
رئیس و راجہ و نواب منتظر ہیں بہ شوق — کہ نائبِ شہِ لندن کی آمد آمد ہے
وہ ہو کے آتے ہیں قائم مقامِ قیصرِ ہند — ستاروں میں مہِ روشن کی آمد آمد ہے
ہیں ان کے ساتھ میں اتنے اکابرِ یورپ — کہ گویا دہلی میں لندن کی آمد آمد ہے
غرض یہ ہے کہ ہو تکمیلِ زینت و رونق — ہر ایک علم کی، ہر فن کی آمد آمد ہے
کمر بندھی نظر آتی ہے آب و آتش کی — اِدھر سے نل اُدھر انجن کی آمد آمد ہے
دکھا رہے ہیں ہنر مند خوابِ مقناطیس — دلوں میں حالتِ روشن کی آمد آمد ہے
اُمنڈ رہی ہے ہر اک سمت سے فراوانی — ہر ایک جنس کے خرمن کی آمد آمد ہے
ورودِ فوج سے ہے زرق برق کا عالم — جدھر کو دیکھیے پلٹن کی آمد آمد ہے
چمک ہے کرچوں کی ہر سو گمک ہے توپوں کی — چھما چھم اور دنا دن کی آمد آمد ہے
چہل پہل ہے، اُمنگیں ہیں، جوشِ مستی ہے — بہارِ عیش پہ جوبن کی آمد آمد ہے
جو پیر ہیں اُنھیں ہیں ولولے جوانی کے — جوان ہیں تو لڑکپن کی آمد آمد ہے
تمام مذہب و ملت میں ہے کشش پیدا — مغان و شیخ و برہمن کی آمد آمد ہے
گرہ میں زر نہیں اور ٹیم ٹام لازم و فرض — اسی سبب سے مہاجن کی آمد آمد ہے

ابھارے رکھتا ہے اکبر کے دل کو فیضِ سخن
اگرچہ پیری و پنشن کی آمد آمد ہے

قطعہ

چاہا جو میں نے ان سے طریقِ عمل پہ وعظ — بولے کہ نظمِ ذیل کو ارقام کیجیے
پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ — خالق کا شکر کیجیے آرام کیجیے

بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم / تحصیل اُن کی بھی سحر و شام کیجیے
یورپ میں پھریے پیرس و لندن کو دیکھیے / تحقیقِ ملک کاشغر و شام کیجیے
ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن / خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجیے
پیرانِ بے فروغ کا گل ہو چکا چراغ / ناحق نہ دل کو تابعِ اوہام کیجیے
رکھیے نہ دل کو دیر و کلیسا سے منحرف / متروک قیدِ جامۂ احرام کیجیے
الفاظِ کفر و فسق کو بس بھول جائیے / ہر ملت و طریق کا اکرام کیجیے
رہیے جہاں میں وسعتِ مشرب سے نیک نام / مجھ کو مرید، ہندؤں کو رام کیجیے
رکھیے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر / دولت کو صرف کیجیے اور نام کیجیے
سامان جمع کیجیے کوٹھی بنائیے / باصد خلوص دعوتِ حکّام کیجیے
آرائشوں سے گھر کو مہذب بنائیے / تزئینِ طاق و سقف و در و بام کیجیے
یارانِ ہم مذاق سے ہم بزم ہو جیے / موقع ملے تو شغلِ مے و جام کیجیے
چشم و لبِ بتاں سے بھی غافل نہ ہو جیے / تکمیلِ شوقِ پستہ و بادام کیجیے
نظارۂ مساں سے تر و تازہ رکھیے آنکھ / تفریح پارک میں سحر و شام کیجیے
مذہب کا نام لیجیے عامل نہ ہو جیے / جو متفق نہ ہو اُسے بدنام کیجیے
طرزِ قدیم پر جو نظر آئیں مولوی / پبلک میں ان کو موردِ الزام کیجیے
زنجیرِ فقہ توڑیے کہہ کر خلافِ شرع / مضمون لکھیے دعویِ الہام کیجیے
ممنوع ہے تعددِ ازواج خاص کر / یوں گھوم پھر کے تنقیۂ عام کیجیے
قومی ترقیوں کے مشاغل بھی ہیں ضرور / اس مد میں بھی ضرور کوئی کام کیجیے
لڑکے نہ ہوں تو ہو نہیں سکتی چہل پہل / فکریں پئے وظیفہ و انعام کیجیے
تحصیلِ چندہ کیجیے لڑکوں کو بھیج کر / سارا علاقہ ہند کا اب خام کیجیے
بے رونقی سے کاٹیے کیوں اپنی عمر کو / کیوں انتظارِ گردشِ ایام کیجیے

جو چاہیے وہ کیجیے بس یہ ضرور ہے ہر انجمن میں دعویٔ اسلام کیجیے
لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے
مُردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجیے

تعجب سے کہنے لگے بابو صاحب گورمنٹ سید پہ کیوں مہرباں ہے
اسے کیوں ہوئی اس قدر کامیابی کہ ہر بزم میں بس یہی داستاں ہے
کبھی لاٹ صاحب ہیں مہمان اس کے کبھی لاٹ صاحب کا وہ میہماں ہے
نہیں ہے ہمارے برابر وہ ہرگز دیا ہم نے ہر صیغے کا امتحاں ہے
وہ انگریزی سے کچھ بھی واقف نہیں ہے یہاں جتنی انگلش ہے سب برزباں ہے
کہا ہنس کے اکبر نے اے بابو صاحب سنو مجھ سے جو رمز اس میں نہاں ہے
نہیں ہے تمہیں کچھ بھی سید سے نسبت
تم انگریزی داں ہو وہ انگریز داں ہے

وفات سر سیّد مرحوم پر

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

قطعہ

اک دوست ہمارے ہیں تپ ان کو شدید آئی
جھیلا کیے بیماری مدت میں شفا پائی

لاہور کے جلسے میں شرکت کو ہیں اب جاتے
حالانکہ ابھی قوت پاؤں میں نہیں پاتے
میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوت
وہ اس کو سمجھتے ہیں لا حول ولا قوۃ
یہ میری غلط بندش وہ ان کی غلط فہمی
میں حد سے بڑا شاعر وہ حد سے سوا وہمی

دعوت نامہ بنام علامہ شبلی نعمانی

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی — بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

قطعہ

کانفرنس احباب سے پر ہے — جو صف ہے وہ سلکِ دُر ہے
سب کو یادِ اُستاد کا گر ہے — دل کش ہر اسپیچ کا سُر ہے

قومی ترقی کی رادھا پیاری — بیٹھی ہیں پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری — چندے کی تحصیل ہے جاری

قوم پہ غالب کورٹ کے عملے — عملے ٹھہرے پارک کے گملے
پھر یہ چندہ کیوں کر دم لے — کتنا ہی لے کوئی پھر بھی کم لے

لائی ہیں سکھیاں بھر کر جھولی — خوب کھلی ہے برج میں ہولی
رنگ میں ڈوبی ہے سب کی چولی — سب نے زباں اس گیت پہ کھولی

شیخ کو اُلفت ہوگئی مِس کی — خوب پیے اب شوق سے وِہسکی
اگلی دُنیا دہر سے کھسکی! — بیٹھا کون ہے شرم ہے کس کی

جمع ہیں ممبر بھولے بھالے — جاڑوں کا موسم بھولے بھالے
آنکھیں پھاڑے دانت نکالے — چندہ دے کر پھنسنے والے

بعض ہیں بادہ وجام کے خواہاں — بعض نمود و نام کے خواہاں
بعض فقط آرام کے خواہاں — کم ہیں فیضِ عام کے خواہاں

مُدعیّانِ رونقِ دیں ہیں — لیکن باہم برسرِ کیں ہیں
واقف فن دہنر سے نہیں ہیں — کم ہیں ان میں جو آخر بیں ہیں

ہر دم قوم کا رونا کیا ہے — اِن باتوں سے ہونا کیا ہے
مفت میں رُپیہ کھونا کیا ہے — شور زمیں میں بونا کیا ہے

دیکھ کے اِک باضابطہ بھبکی! — دُنیا آپ کی جانب لپکی
آپنے سب کی دولت ہپ کی — بزم جمالی خالی گپ کی

آزادی کی پی کے برانڈی
آپ چلاتے ہیں ڈنڈا بانڈی
گاتا ہے قومی کشتی کا ڈانڈی
مکتب گرم ہے سرد ہے ہانڈی

بزم عزا میں کیوں نہ ہو شرکت
جس سے ہو دل میں پیدا عبرت
صوفیوں کی کیوں ڈھونڈیں نہ صحبت
قلب کو جس سے پہنچے فرحت

یہ بے معنی مجلس کیسی
یہ ناحق کی گھس گھس کیسی
یہ بے حکم کی آفس کیسی
بات یہ سٹرم پوئیس کیسی

ہو گیا عقل میں کون اضافہ
خوشبو پھیلی نہ دیکھا نافہ
دیکھ لیا یاروں کا قیافہ
پایا بس خوش رنگ لفافہ

قوم سے اس کی گاڑھی کمائی
آپ نے فقرہ دے کے اڑائی
اور وہ یوں بے سود گنوائی
شاہِ لندن تیری دہائی

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے
قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے چلاؤ تیشے
تاکہ کٹیں افلاس کے بیشے

تم ہو فکرِ جاہ میں الجھے
شہرت و شان کی چاہ میں الجھے
نافہموں کی واہ میں الجھے
دل کیوں کر اللہ میں الجھے

ایک انگریز نے بات یہ کہہ دی — جس نے ترقی وہ دی یہ دی
اس بازی کی ہمیں نے شہ دی — کیسے سید کیسے مہدی

گرمیوں میں بچوں کا ٹھکانا — شہروں شہروں بھیک منگانا
اور اس پر یہ بات بتانا — مفلس لڑکوں کا ہو گا ٹھکانا

آپ کہیں معیوب نہیں ہے — ہم کو تو مرغوب نہیں ہے
عمدہ یہ اسلوب نہیں ہے — ہاں یہ طریقہ خوب نہیں ہے

اس سے بگڑتی ہے قومی حالت — جاتی رہتی ہے شرم کی خصلت
کہتے ہو ہو گی جو یہ جمعیت — ہو گا میل بڑھے گی الفت

تڑپو گے جتنا جال کے اندر — جال گھسے گا کھال کے اندر
کیا ہوا تیس ہی سال کے اندر — غور کرو اس حال کے اندر

کام بہت ہے لوکل و ذاتی — ان کی فکر تو کی نہیں جاتی
مفت میں بچوں کو کر کے براتی — قوم کی گاتے ہیں بھائی دفاتی

کینہ ہم کو ہے نہ حسد ہے — دل میں ضد ہے نہ کوئی کد ہے
لیکن یہ ارشادِ خرد ہے — بھائی ہر شے کی اک حد ہے

آزادی کی پی کے برانڈی　　آپ چلاتے ہیں ڈنڈا بانڈی
گاتا ہے قومی کشتی کا ڈانڈی　　مکتب گرم ہے سرد ہے ہانڈی

بزمِ عزا میں کیوں نہ ہو شرکت　　جس سے ہو دل میں پیدا عبرت
صوفیوں کی کیوں ڈھونڈیں نہ صحبت　　قلب کو جس سے پہنچے فرحت

یہ بے معنی مجلس کیسی　　یہ ناحق کی گھس گھس کیسی
یہ بے حکم کی آفس کیسی　　بات یہ سٹرم پوئیس کیسی

ہو گیا عقل میں کون اضافہ　　خوشبو پھیلی نہ دیکھا نافہ
دیکھ لیا یاروں کا قیافہ　　پایا بس خوش رنگ لفافہ

قوم سے اس کی گاڑھی کمائی　　آپ نے فقرہ دے کے اُڑائی
اور وہ یوں بے سود گنوائی　　شاہِ لندن تیری دہائی

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے　　قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صنّاعی کے چلاؤ تیشے　　تاکہ کٹیں افلاس کے بیشے

تم ہو فکرِ جاہ میں اُلجھے　　شہرت و شان کی چاہ میں اُلجھے
نافہموں کی واہ میں اُلجھے　　دل کیوں کر اللہ میں اُلجھے

خالق کی توحید سکھاؤ — عقبیٰ کی تمہید سکھاؤ
ملحد کی تردید سکھاؤ — رُوحانی اُمید سکھاؤ

مذہب کی تعلیم زبانی — توتا مینا کی ہے کہانی
مُلا جو خود ہو نہ حقانی — پھر تو مکتب ہے شیطانی

جب ہوں گروجی خود البیلے — خوب رچائیں میلے ٹھیلے
راہ پر آئیں کیوں کر چیلے — مندر میں کیوں جائیں اکیلے

اگوا خود جب حق سے ہو غافل — دنیا ہی دنیا دل میں ہو داخل
ساتھی کیوں نہ چلیں رہِ باطل — کیوں کر دین ہو ان کو حاصل

جس نے خیمہ یہاں پر گاڑا — اس کو مبارک ہو یہ اکھاڑا
لیکن قوم کو کیوں ہے پچھاڑا — اِس نغمے پہ گلا کیوں پھاڑا

قطعہ

عشرتیؔ گھر کی محبت کا مزا بھول گئے — کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی — کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
بھولے ماں باپ کو اغیار کے چرچوں میں وہاں — سایۂ کفر پڑا نورِ خدا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی — چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

لے سید عشرت حسین (اکبر کے صاحب زادے)

کیسے کیسے دلِ نازک کو دکھایا تم نے — خبرِ فیصلۂ روزِ جزا بھول گئے
بخل ہے اہلِ وطن سے جو وفا میں تم کو — کیا بزرگوں کی وہ سب جود و عطا بھول گئے
نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں — اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے

کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جب کہ بوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

ایک خط بنام منشی نثار حسین لکھنؤ

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجیے — اس فصل میں جو بھیجیے بس آم بھیجیے
ایسے ضرور ہوں کہ انہیں رکھ کے کھا سکوں — پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجیے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس — سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں — تعمیل ہوگی، پہلے مگر دام بھیجیے

کدھر ہے رنگِ مخالف اب زمانہ بالاتفاق بدلا
خود اپنے نورِ نظر کو دیکھو نگاہ بدلی مذاق بدلا

باہم شبِ وصال غلط فہمیاں ہوئیں — مجھ کو پری کا شبہہ ہوا اُن کو بھوت کا

عشوہ و ناز و ادا سے مسکرانا آگیا — چشمِ بد دور آپ کو بجلی گرانا آگیا

دلوں پہ مارتے جاتے ہیں چھاپہ شکسپیئر — پڑھو گے حضرت سعدی کی بوستاں کب تک
اس انقلاب کا اب انقلاب ہے دشوار — رہو گے منتظرِ مہرِ آسماں کب تک

فیضِ کالج سے جوانی رہ گئی بالائے طاق
وہ چراغوں سے ہیں جلتے ایسے ہیں روشن ضمیر

امتحاں پیشِ نظر اور عاشقی بالائے طاق
کہتے ہیں رکھیے پرانی روشنی بالائے طاق

کیوں کرنے لگے وہ مجھ گدا سے باتیں
میں سجدہ میں کہہ رہا ہوں سبحان اللہ

زوروں پہ ہیں کرتے ہیں ہوا سے باتیں
بیلونؔ میں وہ کریں خدا سے باتیں

رقیبوں نے بہت نظمیں پڑھیں اور دُر فشانی کی
میں اشک آنکھوں میں بھر لایا بلاغت اس کو کہتے ہیں

کوئی کہتا نہیں سیاح ہوں فطرت کا ماہر ہوں!
میں اپنے نوکروں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں بنگلے میں

یہیں تک فخر کی حد ہے میں ڈپٹی ہوں میں ناظر ہوں
"کوئی ہے" لاکھ کہیے کون کہتا ہے کہ حاضر ہوں

جو بات مناسب ہے وہ حاصل نہیں کرتے
بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری

جو اپنی گرہ میں ہے اُسے کھو بھی رہے ہیں
افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

چہرۂ یورپ کا میں پروانہ ہوں
شب میں پیدائش ہوئی ہے پیشِ شمع!

اس کی ہر اک بات کا دیوانہ ہوں
جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں

جو حسرتِ دل ہے وہ نکلنے کی نہیں
یہ بھی ہے بہت کہ دل سنبھالے رہیے

جو بات ہے کام کی وہ چلنے کی نہیں
قومی حالت یہاں سنبھلنے کی نہیں

لہ غبارہ

ملکی ترقیوں میں دِوالے نکالیے
پلٹن نہیں تو خبر رسالے نکالیے
کافی ہے بہرِ شغل کلیسائے فکرِ ترقی
اب دِل سے مسجد اور شوالے نکالیے

یہی فتوائے نیچر ہے کہ ہم بھی ہور ہیں اُن کے
زر اُن کا زور ان کا علم اُن کا سلطنت اُن کی
ملائیں کس طرح سُر صدر پر نزلہ ہے مذہب کا
بہت اونچے سُروں میں بج رہی ہے اب تو گت اُن کی
مگر قومی اطبار دور ہی کر دیں گے یہ نزلہ
قوی اطفال کو کردے گی آخر تربیت اُن کی

جب تک ہم میں ہے قومی حصلت باقی
بے شک پردے کی ہے ضرورت باقی
چالیس برس کی بات ہے یہ شاید
بعد اس کے رہے گی پھر نہ حجت باقی

بہ چشمِ غور دیکھو بلبل و پروانہ کی حالت
وہ اسپیچیں دیا کرتی ہے اور وہ جان دیتا ہے
وہ پھنستی ہے قفس میں اور اس کا نام روشن ہے
ہوا پر خیمۂ معنی کو اکبر تان دیتا ہے

حالت پہلی سی اب کہاں میری ہے
حیرت انگیز داستاں میری ہے
سینہ میرا ہے دل نہیں ہے میرا
میری نہیں بات گو زباں میری ہے

میں نے اکبر سا بھی وہمی نہیں دیکھا کوئی
کہتا ہے اُن کی کمر مجھ کو نظر آتی ہے

مایوس کر رہا ہے نئی روشنی کا رنگ
اس کا نہ کچھ ادب ہے نہ کچھ اعتبار ہے
تقدیس ماسٹر کی نہ لیڈر کا فاتحہ
یعنی نہ نورِ دل ہے نہ شمعِ مزار ہے

حاصل ہو کچھ معاش، یہ محنت کی بات ہے — لیکن سرورِ قلب، یہ قسمت کی بات ہے
آپس کی واہ واہ لیاقت کی بات ہے — سرکار کی قبول، یہ حکمت کی بات ہے
وہ مخبرِ رقیب ہے میں ہوں شہیدِ عشق! — یہ اپنی اپنی ہمت و غیرت کی بات ہے
جاپان و روس سے نہیں کچھ واسطہ ہمیں — حُرجی کی یاں تو بحث ہے نسبت کی بات ہے
بی اے بھی پاس ہوں ملے بی بی بھی دل پسند — محنت کی ہے وہ بات یہ قسمت کی بات ہے

تہذیبِ مغربی میں ہے بوسے تلک معاف
اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

ہم نشیں ظلمِ بتاں پر چپ نہ رہنا چاہیے — بات جب کچھ بن نہ آئے شعر کہنا چاہیے

شاخ میں پھل کا لگا رہنا ہے خامی کی دلیل — عقل پختہ ہو کے میرے سر سے زائل ہو گئی

پیچ مذہب کا کسی صاحب نے ڈھیلا کر دیا — سادہ طبعوں کو بھی بالآخر رنگیلا کر دیا
شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا — وہ مثل ہے مفلسی میں آٹا گیلا کر دیا
تھا بنارس پہلے ہی سے اے صنم رس میں بھرا — چشمِ مِس اینی[۱] نے اور اس کو رسیلا کر دیا

جب اپنے ہاتھ میں لی غیر نے عنانِ سمند — تو پھر سوار سے اکبر پیادہ پا اچھا

ہنگامۂ ترقیِ قومی کو دیکھ کر — ادراکِ حال کے لیے میں ہو گیا کھڑا
کوئی ہوا نہ مجھ سے مخاطب وہاں مگر — چپکے سے میرے کان میں اک غیر نے کہا

---

۱ مسز اینی بسنٹ

اکثر وہی بزرگ ہیں جو ہیں پیے ہوئے
باہوش کم ہیں اُن کے بھی منہ ہیں سیے ہوئے
ہرگز کوئی کہے گا نہ اس انجمن کا راز
کیوں اپنے آپ کو ہے پریشاں کیے ہوئے

پہلے تھا قوم میں سب کچھ مگر اب کچھ نہ رہا
کسی شاعر نے ہے واللہ یہ کیا خوب کہا
شیخ کے پاس ہے اب صرف مصلّی باقی
اور مرے پاس ہے اُردوے معلّی باقی

سعادت رُوح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں
کہ کالج میں کوئی اس بات کا ماہر نہیں ہوتا

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پامال
بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھل گیا
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ساتھ اُن کے مرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا
بندر کی طرح اونٹ اُچھل ہی نہیں سکتا

کیا کہوں اس کو میں بدبختیِ نیشن[1] کے سوا
اس کو آتا نہیں اب کچھ اِمی ٹیشن[2] کے سوا

مری تقریر کا اس میں پہ کچھ قابو نہیں چلتا
جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا
کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہِ حبِّ قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا وہ بولے تو نہیں چلتا
کہا پیرِ طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

ہر قدم اُن کا شہیدِ لغزشِ مستانہ تھا
سر میں تھا سید کے قرآن زیرِ پا میخانہ تھا

---

۱ قوم nation   ۲ نقل imitation

تجھے انگلش سے جب موقع نہیں ہے گرم جوشی کا
تو پھر کیا لطف ہے اے ہم نفس اِس بادہ نوشی کا
تکلّف سے جواب اُس نے دیا سُن کر کہ اے اکبرؔ
ادا کرتا ہوں میں یہ حق فقط پتلون پوشی کا

دل چھوڑ کر زبان کے پہلو پہ آ پڑے
ہم لوگ شاعری سے بہت دور جا پڑے

حاضر ہوا میں خدمتِ سیّد[1] میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ کو دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

ڈیلی گیٹوں نے جو شملے میں بہم کی ہے صلاح
بعد عمدہ کھانے کے ایسی ڈکاریں ہیں مباح
سنٹرل بھی ہو کمیٹی اور پراونشل بھی ہو
حامیِ پبلک بھی ہو رُخ جانبِ کونسل بھی ہو
بابوؤں کی طرح لیکن غل سے کچھ مطلب نہ ہو
کردیں بس توضیح جز و کل سے کچھ مطلب نہ ہو
ولولے ایسے نہیں محتاج کچھ تصریح کے
کیوں نہ ہو دانے تو ہیں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے
گندھ کے اب قومی گلے کا ہار ہو جائیں گے یہ
پالسی کے طرۂ دستار ہو جائیں گے یہ
بحثِ ملکی میں تو پڑنا ہے نری دیوانگی
پالسی اُن کی رہے قائم ہماری دل لگی
ہم یہ کہتے ہیں کرو جو استخارہ راہ دے
تم فقط پتلے بنا سکتے ہو جان اللہ دے

یہ بات غلط کہ ملکِ اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش
یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

---

[1] سر سید احمد خاں

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

کونسل میں شریک ہو گا کُل ملک
اب ٹھیکس کا باندھ دے گا پُل ملک
اونچا سنتی ہے کیا گورمنٹ
کیوں کرتا ہے اتنا شور و غل ملک
ہوتی ہے روش جو سلطنت کی
جاتا ہے اُسی طرف کو ڈھل ملک
غنچے کی طرح سمٹ کے ابھرو
اس وقت کھِلے گا شلِ گُل ملک

اکبر اس اندیشہ میں رہتا ہے غرق
کافر و نیٹو میں ہے تھوڑا ہی فرق
کافری کا ہے علاج ایمان سے
نیٹویت تو ہے لپٹی جان سے

واں شوکت و زینت کے جو اسباب بہت ہیں
معنی کے یہاں گوہرِ نایاب بہت ہیں
صاحب کی سی محفل تو میسر نہیں لیکن
صد شکر کہ اکبر کے بھی احباب بہت ہیں

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں
پہنچائے گا قوت شجرِ ملک کی بُن میں
تحریکِ سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دُھن میں

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں
موافق اپنے اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں
ترانے میرے ہم آہنگِ دیر و کعبہ ہیں یکساں
زباں پر میری موزوں ہوتی ہے حمد اور بھجن دونوں
مجھے ہوٹل بھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دوارا بھی
تبرک ہے مرے نزدیک پرشاد و کٹن دونوں

---

native ۵ ؎

یا کس کے کمر پہ خوشامد باندھو — یا حجرے میں گھس کے بیٹھو تہمد باندھو
کیا فائدہ بے قرینگی سے اے شیخ — بہتر ہے یہی کہ اپنی اک حد باندھو

زندگی اور قیامت میں ریلیشن[۱] سمجھو — اس کو کالج اور اُسے کانووکیشن[۲] سمجھو
ہو جنہیں مقدرتِ وضع و نفاذِ قانون — بس انہیں کو صفِ اقوام میں نیشن[۳] سمجھو
آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا وہ یار — طپشِ قلب کو بنگال اجی ٹیشن[۴] سمجھو

پردہ اُٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی! — جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سُن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک — یہ اگر سچ ہے تو بے شک پیرِ نابالغ ہیں وہ

کونسل سے ہر طرح کا قانون آ رہا ہے — مطبع سے ہر طرح کا مضمون آ رہا ہے
لیکن پڑھوں میں کیوں کر آنکھوں کی یہ حالت — اشک آ رہے تھے پہلے اب خون آ رہا ہے

باغوں میں تو بہار درختوں کی دیکھ لی — کالج میں آ کے کانووکیشن کو دیکھیے
لیموے کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے — اب کاغذی ترقیِ نیشن کو دیکھیے

سابق کے طریقوں پہ عمل کر نہیں سکتے — کل آج نہ تھا، آج کو کل کر نہیں سکتے
الزام کہیں مشقِ قواعد کا نہ لگ جائے — صوفی بھی بہت کود اُچھل کر نہیں سکتے

---

۱ relation — ۲ convocation
۳ nation — ۴ agitation

ہے نئی روشنی اک لوکل و ذاتی ترکیب　　لفظ ہی لفظ ہیں جتنے ہیں زوائد اس کے
لمپ بجلی کا ہے یہ مہرِ جہاں تاب نہیں　　جب اندھیرا ہو تو ظاہر ہوں فوائد اس کے

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے　　دُنیا تو گئی دین بھی برباد کریں گے
جب خود نہیں رہنے کے کسی اصل پہ قائم　　کیا خاک وہ قائم کوئی بنیاد کریں گے
بارک کوئی کر دے گی عطا ان کو گورمنٹ　　یا کالونی اپنی کوئی آباد کریں گے

خوب فرمایا یہ شاہِ جرمنی نے پوپ سے　　وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہانِ توپ سے
جدِّ امجد خود میں کرتے تھے یہ موسم بسر　　ہم کو اپنے عہد میں پالا پڑا کنٹوپ سے

گلوں کو دیکھ کر کہتا ہے وہ شوخ　　ہمارا رنگ بھی پھیکا نہیں ہے

عاشقوں کے بھی معین ہو گئے ہیں اب حقوق　　عہدِ انگریزی ہے یہ اے جانِ جاں شاہی گئی

نفے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی　　چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانی آخر　　پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

قطعہ

خواہانِ نوکری نہ رہیں طالبانِ علم
قائم ہوئی ہے رائے یہ اہلِ شعور کی
کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

مخمس

بکری کو ساگ پات کا سودا نہیں رہا　　بنگالیوں کو بھات کا سودا نہیں رہا
چوروں کو اپنی گھات کا سودا نہیں رہا　　اور شاطروں کو مات کا سودا نہیں رہا
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

بنیوں کو اخذِ سود کی فرصت نہیں رہی　　منعم کو داد و جود کی فرصت نہیں رہی
لڑکوں کو کھیل کود کی فرصت نہیں رہی　　کودن کو غت ربود کی فرصت نہیں رہی
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

گاہک کو مول بھاو کی پروا نہیں رہی　　مانجھی کو اپنی ناو کی پروا نہیں رہی
دل کو کہیں لگاو کی پروا نہیں رہی　　چوہوں کو نان پاو کی پروا نہیں رہی
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

بچے فراغِ طبع سے اب کھیلتے نہیں　　اُبھرے ہوئے جوان بھی ڈنڈ پیلتے نہیں
عشاق رنجِ ہجرِ بتاں جھیلتے نہیں　　پاپڑ فروش پاپڑوں کو بیلتے نہیں
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

لیتا ہے کون گرمیِ دل سے خدا کا نام　　اب کون دھیان باندھ کے کرتا ہے رام رام
مذہب کو دور ہی سے کیا جاتا ہے سلام　　کوٹھی کو ہے فروغ نہ رونق پہ ہے گدام
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

کم ہو گیا ہے لوگوں میں آپس کا میل جول　　وہ ٹولیاں نظر نہیں آتیں نہ اب وہ غول
تاشے نہ شادیانے کے بجتے کہیں نہ ڈھول　　مخبوط، بدحواس، پریشان، گول مول
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

اسکول ہی میں علم ہے جس سے کہ ہے شرف　　لڑکا نہ سیکھے علم تو کہتے ہیں ناخلف

لیکن کچھ اور دھندے بھی ہیں پیش صف بصف ۔ یہ کیا کہ ساری قوم ہی جھک جائے اک طرف
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک
پنڈت پراجما کے بنارس پہ آ رہے ۔ مرکٹ کے شیخ شہر بھی نو۔لیس پہ آ رہے
حالی غزل کو چھوڑ مسدس پہ آ رہے ۔ ہم فرد تھے سو ہم بھی مخمس پہ آ رہے
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

اسمال نہیں گریٹ ہونا اچھا ۔ دل ہونا بُرا ہے پیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو کہ مولوی ہو دونوں بیکار ۔ انسان کو گریجویٹ ہونا اچھا

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردی ۔ کہ پردہ کھل گیا اِس قوم میں زنانوں کا
پری کی زلف میں اُلجھا نہ ریشِ واعظ میں ۔ دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے ۔ خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

ہر رنگ کی باتوں کا مرے دل میں ہے جھرمٹ ۔ اجمیر میں کلچا ہوں علی گڑھ میں ہوں بسکٹ
پابند کسی مشرب و مِلّت کا نہیں ہوں ۔ گھوڑا مری آزادی کا اب جاتا ہے بگٹٹ

انہیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی ۔ نکلتی ہیں دعائیں اُن کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر
حقیقت میں میں بلبل ہوں مگر چارے کی خواہش میں
بنا ہوں ممبرِ کونسل یہاں مٹھو میاں ہو کر

ل چھوٹا small ۔ ل۲ بڑا great ۔ ل۳ graduate

مذہب کے جو ہو رہیں تو سرکار کا خوف
مذہب سے اگر پھریں تو پھٹکار کا خوف
دونوں سے اگر بچیں تو احباب کو ہے
بے رونقیِ دُکان و دربار کا خوف

شیخ صاحب کو نہیں شاعروں کی بات سے کام
حسن کی قید نہیں بس ہے مسمّات سے کام
یاں تو بریانی کے افسانوں سے دل بریاں ہے
بابو ہی اچھے کہ ان کو ہے فقط بھات سے کام
کہتے ہیں ہم کو جو چندہ دے مہذب ہے وہی
اس کے افعال سے مطلب ہے نہ عادات سے کام

بوسہ کیسا کہ گلوری بھی نہیں پاتا ہوں
بس کلام اپنا انہیں جا کے سُنا آتا ہوں
وہ یہ فرماتے ہیں کیا خوب کہا ہے واللہ
میں یہ کہتا ہوں کہ آداب بجا لاتا ہوں

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے یہ چوکتا بھی نہیں

سوپ[1] کا شائق ہوں یخنی ہوگی کیا
چاہیے کٹلٹ[2] یہ قیما کیا کروں
لیتھبرج کی چاہیے ریڈر مجھے
شیخ سعدی کی کریما کیا کروں
کھینچتے ہیں ہر طرف تانیں حریف
پھر میں اپنے سُر کو دھیما کیا کروں
ڈاکٹر سے دوستی لڑنے سے بیر
پھر میں اپنی جان بیما کیا کروں
چاند میں آیا نظر غارِ مہیب
ہائے اب اے ماہ سیما کیا کروں

نیچری وعظ مہذّب کو لیے پھرتے ہیں
شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لیے پھرتے ہیں
ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں
ہم تو اک شوخِ شکرلب کو لیے پھرتے ہیں

---

[1] soup
[2] cutlet

کل مستِ عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں — اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں
دُنیا اُسے قرار دو اور آخرت یہ ہے — سُن لو کہ سازِ معنیٔ اکبر کی گت یہ ہے

قلیوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اعزازِ نسب کے مٹتے جاتے ہیں نشاں — اگلے سے خیال ہند میں اب وہ کہاں
سیّد بننا ہو تو بنو سر سیّد — ہونا ہو خان تو تم ہو انگریزی خواں

غزل میری سُنتے نہیں شیخ جی — تقدس کی بھی انتہا ہو گئی
تکلف کے پکوان میں دن ڈھلا — ہماری تو پوری سزا ہو گئی
اضافہ ہوئی مجھ سے گندم پہ مے — یہ پوتے سے بھی اک خطا ہو گئی
یہ تھی قیمتِ رزق لُوٹے جو دانت — غرض کوڑی کوڑی ادا ہو گئی

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے — دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

علم پر بھی عشق کی تاثیر آخر پڑ گئی — تخلیے کی بات پبلک کے دلوں میں گڑ گئی
وصل کی شب میں نے اس بت سے لڑائی تھی زباں — یہ اثر اس کا ہوا اردو سے ہندی لڑ گئی

کچہریوں میں ہے پرسش گریجویٹوں کی — سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور مٹیوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقویٰ کی
خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

امورِ ملکی کی بحث میں تم جو ہندوؤں کے بنو گے ساتھی
نہ لاٹ صاحب خطاب دیں گے نہ راجہ جی سے ملے کا ہاتھی
نہ اپنا مکھن وہ تم کو دیں گے نہ اپنی پوری وہ بانٹ دیں گے
پڑے گا موقع جو کوئی آ کر تو دونوں ہی تم کو چھانٹ دیں گے
مگر وہ رہتے ہیں دور تم سے یہ لوگ ساتھی ہیں اور پڑوسی
ملے جلے ہیں سوسائٹی میں اہیران میں تو ہم میں گھوسی
ہنزل کو اپنی جو چھوڑ کر تم انہیں کی شرکت کرو زٹل میں
تو یہ تو کوئی نہ کہہ سکے گا تمہارے دشمن کہاں بغل میں!
نہ ہوگی حکام کو بھی دقّت جو ہو گی اک جا ہر اک کی خواہش
ضرورت ان کو بھی یہ نہ ہوگی کریں ہر اک سے علیحدہ عرفش
جو مانگو گے ایک پھل مسلّم وہ کاٹ کر ایک پھانک دیں گے
چلاؤ گے پھر بھی منہ تو سب کو وہ ایک لاٹھی سے ہانک دیں گے

اٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے
کہاں کے قبلہ کہاں کے قبلی جنید کیسے کہاں کے شبلی
عوض تصوف کے ہم نے طب کی بنیں گے سرجن مزا کریں گے
اجل سے بھی پھر نہ ہوں گے خائف مزاج سے اپنے ہوں گے واقف
اثر کرے گی ہوا مخالف تو آپ اپنی دوا کریں گے

پوچھا میں نے کہ تیرا مذہب کیا ہے
کہنے لگا اس سے تیرا مطلب کیا ہے

میں نے یہ کہا کہ غول بندی کے لیے
بولا کہ شکست کھا چکے۔ اب کیا ہے

چشمِ جہاں سے حالتِ اصلی چھپی نہیں
اخبار میں جو چاہیے وہ چھاپ دیجیے
دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق کو تو ناپ دیجیے
سُنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے
اُس بُت کے در پہ غیر سے اکبر نے کہہ دیا
زر ہی میں دینے لایا ہوں جان آپ دیجیے

نہ کچھ انتظارِ گزٹ کیجیے
جو افسر کہے بس وہ جھٹ کیجیے
کہاں کا حلال اور کیسا حرام
جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجیے
سکھاتے ہیں تقلیدِ انگلش جو آپ
کہیں مفلسوں کو نہ پٹ کیجیے
بہت شوق انگریز بننے کا ہے
تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجیے
اجل آئی اکبر گیا وقتِ بحث
اب اِف[1] کیجیے اور نہ بٹ[2] کیجیے

دِن تو جنّات کی خدمت میں بسر ہوتا ہے
رات پریوں کی خوشامد میں گزر جاتی ہے
سلف رسپکٹ[3] کا وقت آئے کہاں سے اکبر
دیکھ تو غور سے دنیا کو کدھر جاتی ہے

نوکروں پر جو گزرتی ہے مجھے معلوم ہے
بس کرم کیجیے مجھے بیکار رہنے دیجیے
راہ میں لیسنس ہی کافی ہے عزت کے لیے
بس یہی لے لیجیے تلوار رہنے دیجیے
ڈاکٹر صاحب سے ملنا آپ کا اچھا نہیں
بیٹھے گھر میں مجھے بیمار رہنے دیجیے
تیزیِ مے کا اثر تھا نزع کی آمد نہ تھی
خیر اُٹھیے توبہ استغفار رہنے دیجیے

ف۱ if اگر   ف۲ but مگر   ف۳ sefrespect خودداری

شو میکری[۱] شروع جو کی اک عزیز نے — جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے
پوچھا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی! — مورث تمہارے آئے تھے غزنی و غور سے
کہنے لگے ہے اس میں بھی اک بانکی نوک کی — روٹی ہم اب کماتے ہیں جوتے کے زور سے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا — آپ بی۔اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

یاروں کو فکرِ روزِ جزا کچھ نہیں رہی — بس کام ہے انہیں رہِ عیش و نشاط سے
کہتے ہیں حرج کیا ہے جو باریک ہے وہ پُل — بائیسکل پہ گزریں گے ہم پُل صراط سے

خلقت اسی سمت صف بہ صف جاتی ہے — با عود و رباب و چنگ و دف جاتی ہے
ہے نورِ خدا بھی طالبِ رزق کا دوست — ڈاڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

کچھ شک نہیں کہ حضرتِ واعظ ہیں خوب شخص — یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

سب سمجھتے ہیں کہ یہ عشقِ بتاں اک روگ ہے — لیکن اس کو کیا کریں ملتا جو موہن بھوگ ہے
شاہدانِ مغربی کرتے نہیں مجھ کو قبول — ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر آپ کالا لوگ ہے

دل میں جو پڑ گئی ہے گرہ کھول ڈالیے — اک دم میں کل متاعِ سخن تول ڈالیے
ترکیب ہے ترقیِ اردو کی بس یہ خوب — جو آپ بول سکتے ہیں سب بول ڈالیے

۱؎ جوتا بنانے کا کام

بابو جی کا وہ بُت ہوا نوکر
غیر اس کو پیام دیتا ہے
بابو کہتے ہیں وہ نہ جائے گا
میرے انڈر میں کام دیتا ہے

ان کو کیا کام ہے مروّت سے
اپنے رُخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے
جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں
ڈاکٹر فیس کو نہ چھوڑیں گے

راہ تو مجھ کو بتا دی خضرؑ نے
اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

اب تو جاگو ایشیائی بھائیو
نیند میں غفلت کی صدیوں سو لیے
ہو مبارک جستجوئے خضرؑ انہیں
ہم تو اب انجن کے پیچھے ہو لیے
اب تھیٹر میں ہنسیں گے جا کے خوب
خانقاہوں میں تو برسوں رو لیے

ہوتا ہے نفخ یورپین نان پاؤ سے
میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی پلاؤ سے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے
دھمکا کے بوسہ لوں گا رُخِ رشکِ ماہ کا
چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

ہیں لیمپ عزیز، شمع بیگانہ ہے
جلتا ہے چراغ سے جو فرزانہ ہے
سب کی ہے مِسوں کے روئے روشن پہ نگاہ
جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

مارو کژدم رہ گئے کیڑے مکوڑے رہ گئے ۔۔۔ صورتیں تو ہیں مگر انسان تھوڑے رہ گئے
خضر عنقا ہو گئے موذی بنے ہیں سدّ راہ ۔۔۔ گر گئے سنگِ نشاں سڑکوں پہ روڑے رہ گئے
پردہ در کی رائے سُن کر بیبیاں کہنے لگیں ۔۔۔ اب ہمارے وارث ایسے ہی نگوڑے رہ گئے
شیخ صاحب چل بسے کالج کے لوگ اُبھرے ہیں اب ۔۔۔ اونٹ رخصت ہو گئے پولو کے گھوڑے رہ گئے

عاشقی کا ہو بُرا اس نے بگاڑے سارے کام ۔۔۔ ہم تو اے۔ بی میں رہے، اغیار بی۔ اے ہو گئے

پردہ کا مخالف جو سنا بول اُٹھیں بیگم ۔۔۔ "اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے"

نہ تو انگریز بنے ہم نہ مسلمان رہے ۔۔۔ عمر سب مفت میں کھویا کیے نادان رہے
طاقت اسلام کی کہتی تھی مسلمانوں سے ۔۔۔ جب میں جاؤں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے
ان کی سب سنتے ہیں اپنی نہیں کہہ سکتے کچھ ۔۔۔ کیا قیامت ہے زباں کٹ گئی اور کان رہے
تھی بہت اُن کو مسلمانوں کی تہذیب کی فکر ۔۔۔ بولے مسجد کے تلے مے کا بھی سامان رہے

راحتِ جاں ہے تری نظمِ دل آویز اکبرؔ
تندرستی رہے، ایمان رہے، جان رہے

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو ۔۔۔ کس کو سونپیں تمہیں، اللہ نگہبان رہے

مذہب نے پکارا اے اکبرؔ اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔۔۔ یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہر بات پہ تم قسمیں کھانا جب یاد کریں راجہ صاحب ۔۔۔ دربارِ اودھ میں اے اکبرؔ واللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
ملنے کا کسی سے ہے یہ مزا ایک جوشِ طبیعت ہو پیدا ۔۔۔ اس بزم میں میرے پہونچنے پر آ خاہ "نہیں تو کچھ بھی نہیں"

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مذہب نے کہا کہ جان سے عاری ہیں
آپس ہی کے لوگ باعث خواری ہیں
گویا قزاق تھے ہوئے ہیں اب اسیر
اپنوں ہی میں کچھ گواہ سرکاری ہیں

حیراں ہیں اس زمانے میں ہم جی کے کیا کریں
جائز سہی شراب مگر پی کے کیا کریں
تعلیم اونچے درجے کی ہوتی نہیں نصیب
پھر گھر میں بیٹھ کر بجز اے بی کے کیا کریں

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنّت ہے بند
کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

گورمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو اُتریں وہ تانیں اُڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو
جامۂ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع میں
پھینکیے اب کوٹ کو تہ کیجیے پتلون کو

بے ہنر ہو کر جو بیٹھو طعنۂ حالی سنو
با ہنر ہو کر جو چمکو قوم سے گالی سنو
ہم کو تو پیرِ طریقت نے یہی دی ہے صلاح
قصۂ منصور دیکھو اور قوّالی سنو

صاحب سے اذن لے کے کروں گا میں عشقِ چشم
لیسنس ہے ضرور ہرن کے شکار کو

پیتا ہوں شراب آبِ زمزم کے ساتھ
رکھتا ہوں اک اونٹنی بھی ٹم ٹم کے ساتھ
ہے عشق حقیقی اور مجازی دونوں
قوال کی بھی صدا ہے چھم چھم کے ساتھ

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

بے پاس کے تو ساس کی بھی اب نہیں ہے آس
موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

مرے شکووں سے کیوں بھرتے ہیں وہ اخبار کے کالم
کوئی یہ شیخ سے کہہ دے کہ سنیے قبلۂ عالم
جدھر صاحب اُدھر دولت جدھر دولت اُدھر چندہ
جدھر چندہ اُدھر آنر جدھر آنر اُدھر بندہ

تنہائی و طاعت کا یہ دور ہے اب دشمن
پیڑوں پہ نہ وہ طائرِ صحرا ہے نہ وہ جوبن
جنگل کے جو تھے سائیں وہ ریل کے ہیں پائیں
املی کی جگہ سگنل قمری کی جگہ انجن
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

جورِ فلک کا ماجرا آپ سے کیا بیاں کریں
تفرقہ دیکھیے ذرا ہم پہ یہ ہیں عجیب دن
عقل سپردِ ماسٹر۔ مال سپردِ آں جناب
جان سپردِ ڈاکٹر روح سپردِ ڈارون

پریڈ پر شیخ جی پکارے کہ ہم تو اب بھی مطیعِ رب ہیں
کہا کسی نے یہ مسکرا کر بڑے میاں تو بڑے غضب ہیں
گریجویٹ ایک بڑھ کے بولا حضور پروا کریں نہ ان کی
ضعیف و خستہ، خراب و رسوا یہ میہمانِ دو چار شب ہیں

اکبرؔ کے کلام میں مزہ کچھ بھی نہیں
گو اس نے بہت کہا، کہا کچھ بھی نہیں
زلف و کمرِ بتاں کا مفقود ہے ذکر
شیطان پہ طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

بنے بندر سے ہم انسان ترقی اس کو کہتے ہیں
ترقی پر بھی نیٹو؟ بد نصیبی اس کو کہتے ہیں

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور
کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
تہِ دل سے ہم کو سنتے ہیں مگر
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں
الو کھے ہیں مشاغل حضرتِ اکبرؔ کے ان روزوں
الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں
مرید اُن کے تو شہروں میں اڑے پھرتے ہیں موٹر پر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو
ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو
کہہ دیا صاف ہم نے اے مہراج
ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج
ما مقیمانِ کوے دلداریم
یا ڈیپوٹیشن است یا غمِ میم

قسمت کا نام لے کر اب بھی گلہ ہے جائز
لیکن اسی کو، بی۔ اے، ایم اے جو ہو چکا ہے

لڑیں کیوں ہندوؤں سے ہم یہیں کے اُن سے پینے ہیں
ہماری بھی دُعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو

مگر ہاں شیخ جی کی پالیسی سے ہم نہیں واقف
سی پر ختم کرتے ہیں کہ جو صاحب کی مرضی ہو

ذرّہ ذرّہ سے لگاوٹ کی ضرورت ہے یہاں
عافیت چاہے تو انسان زمیندار نہ ہو
شیخ صاحب یہ مے سرخ مجھے تو ہے مفید
شغل کچھ آپ بھی فرمائیں جو انکار نہ ہو
مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہ ہو
چھیڑ سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو
توپ کی طرح چل اس عہد میں گو منہ ہو سیاہ
سرخروئی اب اسی میں ہے کہ تلوار نہ ہو

ہے طریق جدید خشک مزاج
میرے حق میں قدیم چال اچھی
گو کہ اس میں ذرا ثقالت ہے
پھر بھی بسکٹ سے شیرمال اچھی

چیز وہ ہے جو بنے یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

روح پرور نہ سہی نشہ ذرا تیز تو ہے
نوجوانوں کے لیے ولولہ انگیز تو ہے
نہ سہی معنیِ قومی فقط الفاظ سہی
چند احباب کا اک شغلِ دل آویز تو ہے

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بے چارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے
کہاں باقی رہے ہم میں وہ اورادِ سحر گاہی
وظیفے کی جگہ یا پانیر یا آئی۔ڈی۔[1] ٹی ہے
گئے شربت کے دن یاروں کے آگے اب تو اے اکبر
کبھی سوڈا کبھی لمنڈ کبھی وسکی کبھی ٹی ہے

---

[1] یہ بھی ایک اخبار کا نام ہے جو لکھنؤ سے نکلتا تھا Indian Daily Telegraph

گل پھینکے ہے یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی
اغیار تو دُنیا ہیں اُٹھائے ہوئے سر پر
ہم بیٹھے ہیں اس طرح کہ اُٹھتا نہیں سر بھی
اغیار تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف
ہم وہ ہیں کہ پاتے نہیں اس بت کی کمر بھی

وہ تو گرجا پر رُکا اور یہ گیا کعبے کو پھاند
شیخ کا ٹٹو تو انجن سے بھی بڑھ کر تیز ہے

وضعِ مغرب سے مجھے کچھ بھی تسلّی نہ ہوئی
ناز تو بڑھ گئے دولت کی ترقی نہ ہوئی

حکّام پہ بم کے گولے ہیں اور مولویوں پر گالی ہے
کالج نے یہ کیسے سانچوں میں لڑکوں کی طبیعت ڈھالی ہے

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

مکّے تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

کچھ الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

مل جاتا ہے دنیا سے اس کو جس شخص کا جتنا حصّہ ہے
ہے اتنی بات ٹھکانے کی باقی تو کہانی قصّہ ہے

میں نے جو کہا دیکھو تو ذرا اب قوم پہ کیسا جوبن ہے'
وہ ہنس کے لگے کہنے صاحب یہ قوم نہیں ہے پلٹن ہے'

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

ڈر ہے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

بزرگانِ ملت نے کی ہے توجہ
کمی پر رہیں گے نہ عالم نہ عابد
ترقی دیں ہو گی اب روز افزوں
علی گڑھ کا کالج ہے لندن کی مسجد

ہاں آپ جو فرمائیں تو سب ہیں ہمہ تن گوش
آپس میں تو اب کوئی کسی کی نہیں سنتا

اس دورِ فلک میں کوئی کیا دیکھے گا
جو کچھ دکھلائے گا خدا۔ دیکھے گا
رنجیدہ ہے جس نے ابتدا دیکھی ہے
بے رحس ہوگا جو انتہا دیکھے گا

ہم تو ہر حال کو ماضی ہی سمجھ لیتے ہیں
لوگ مر جائیں گے اور وقت گزر جائے گا

حواس مختل سمجھ پریشان عمل میں سستی قدم میں لغزش
کبھی کوئی شوق رہنما ہے کبھی کوئی پالیسی ہے غالب

مرے مشاغل کی کچھ نہ پوچھو کہ میں ہوں دورِ فلک میں اکبر
مقیمِ دیر و مریدِ شیخ و اسیرِ قانون و محوِ مغرب

اگلی روش جو تھی، وہ تھی پیغمبری کی بات
موجودہ ہر طریق ہے کاریگری کی بات

آنے والے نہ رہے انجمنِ دل کی طرف
کوئی کالج کی طرف ہے کوئی کونسل کی طرف

بل کھاؤ ہزار خواہ چھانٹو منطق
نیچر تو ہے اصل ہی پر عاشق
لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات
مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق

کوئی کہتا ہے رکھو صاحب سے میل
کہ آنر کی گھر میں رہے ریل پیل
کسی کی صدا ہے کہ ہندو بھلے
مری انجمن بھی اسی رُخ چلے
کسی سمت کونسل کی ہے دل میں چوٹ
عوض لٹھ کے آپس میں چلتے ہیں ووٹ
کسی سر میں ہے لیڈری کی ہوس
کوئی شہدِ اسپیچ کی ہے مگس
کوئی شوقِ تحقیق میں غرق ہے
کوئی راہِ تقلید میں برق ہے
کسی کو ہے مضموں نگاری کی دھن
کوئی چندہ دینے کو سمجھا ہے پُن
کسی کو عمارت بنانے کا شوق
کسی کو نمود و نمائش کا ذوق
کسی کو کوئی ٹوک سکتا نہیں
سڑک کو کوئی روک سکتا نہیں
جدھر بحرِ ہستی بہائے بہیں
خدا سے دعا ہے کہ سب خوش رہیں
مگر شیخ سعدی کی ہے ایک بات
مسلماں کو ہے فرض اُدھر التفات
خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

بُت کی سی اگر کہیں تو اللہ کہاں   اللہ کا نام لیں تو یہ واہ کہاں!
خاموش رہیں تو دل کو بے چینی ہو   بھاگیں تو سکت کسے ہے اور راہ کہاں

نہ ہوں جو شعر مرے آپ کو پسند نہیں   پسند فرض نہیں اور مجھے گزند نہیں
بجز خطائے نظر اور سہو کاتب کے   کچھ اعتراض اگر ہیں تو سودمند نہیں
حدود میں نے معین کیے ہیں اپنے لیے
اور ان حدود کے اندر کہیں میں بند نہیں

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں   مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشے کو کیا کریں
فرہاد سے کہا کہ مناسب ہے تجھ کو صبر   کہنے لگا بتائیے تیشے کو کیا کریں

صلح رہی اب نہ گوارا ہمیں   سلف گورنمنٹ نے مارا ہمیں
کام تو جو کچھ ہے وہ ہے آپ کا   نام ہی نے صرف ابھارا ہمیں
درد کسی کا نہ رہا دل میں اب   خوب دیا تم نے بھپارا ہمیں
قوم کی تفریق میں ٹکڑے اُڑے   ملک سے اب کیا ہے سہارا ہمیں
آئینہ ہے حسرتِ دنیا کا حال   یاد ہیں اسکندر و دارا ہمیں
جلوہ دکھانے کا انہیں شوق ہے
کاش مبارک ہو نظارا ہمیں

یہ تو مشکل ہے کہ آپ اسپیچ دیں ہم چپ رہیں   ہاں مگر اس میں نہیں کچھ عذر جو کہیے کہیں
مرد جنٹلمین ہو کر پا رہے ہیں جب عروج   بیبیاں پھر گھر میں رنج کس لیے سہیں

مطمئن رہیے نہ رہ جائے گا عورت کا حجاب — چادرِ قومی کی آخر کھلتی جاتی ہیں تہیں
اِک طرف دامِ ترقی اک طرف موجِ شراب — ہر طرح حاضر ہیں ہم کہیے پھنسیں، کہیے بہیں

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمہیں
اچھا جوابِ خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

وہ نیو قوم کی ہے نہ پشتہ نہ بھیت ہے — بگڑے جو بن رہے ہیں یہ دنیا کی ریت ہے

مجھ گدا کو کر دیا رخصت جو دے کر عطر پان — فاقہ تو ٹوٹا نہیں - ہاں عزت افزائی ہوئی
مرکزِ دل بزمِ مشرق میں کوئی ملتا نہیں — ہر طبیعت مغربی چکر میں ہے آئی ہوئی
مذہب و وضع و زبانِ قوم کا کس کو خیال — جب اکابر کی نظر آرٹ کی شیدائی ہوئی
نظمِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب — یہ اسے معلوم ہے ملتی نہیں آئی ہوئی

کہتے ہیں وہ کہ اکبر کچھ باولا ہوا ہے — مذہب میں بات کیا ہے مسجد میں کیا دھرا ہے
اک روز لاٹ صاحب سے بھی تو پوچھ دیکھیں — گرجا میں کیا دھرا ہے جمتا جو واں پڑا ہے

موڑے نہ گردن کبھی اے یار نکالی
تو نے نہ مری حسرتِ دیدار نکالی

کشتِ دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے　　دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے

جب نئے عشووں کے نقشے زیبِ ٹیبل ہو گئے　　بیسیوں بندے خدا کے آنریبل ہو گئے

دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے　　زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کے تین ہے

دیکھ آئے قوم سنتے تھے جسے　　چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے
بار آور پارک میں یہ ہوں گے کیا　　گملوں ہی پر رہ گئے ہیں پھول کے

ہو خیر یارب اکبرِ آشفتہ حال کی　　سرجن رقیب اور دوا اسپتال کی

جانتا ہوں ہو رہا ہے جو نہ ہونا چاہیے　　بحث یہ ہے کب تلک اس غم میں رونا چاہیے

اک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے　　اک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے
دونوں ہیں گو کہ اپنی جگہ مستحقِ داد　　منزل سے اس کو کام ہے اس کو کلیل ہے

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اک دامِ بلا ہے　　اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ نہ ہوتے
یہ آپ کی برکت ہے کہ پیچیدگیاں ہیں　　بہتر تھا کمیٹی میں اگر آپ نہ ہوتے

زندگی ہی میں بتدریج ہیں مرتے جاتے
وقت کے ساتھ ہی ہم بھی ہیں گزرتے جاتے

مری سمجھ سے ہے باہر محیطِ بے مرکز
ترقیاں ہوئیں کس کی جو قوم ہی نہ رہی
تمام قوم اڈیٹر بنی ہے یا لیڈر
سبب یہ ہے کہ کوئی اور دل لگی نہ رہی

لفظ قومی پر بلا مرکز اکڑنا چاہیے
اس کے یہ معنی ہوئے آپس میں لڑنا چاہیے

عیش کا بھی ذوق دیں داری کی شہرت کا بھی شوق
آپ میوزک ہال میں قرآن گایا کیجیے

اُسے اکبر ہمارے دل کا تڑپانا نہیں آتا
کہ جس کو علم تو آتا ہے شرمانا نہیں آتا

جب ایسی قوم ہے تو پیشوا بھی اس کے ایسے ہیں
مثل سچ ہے کہ جیسی رُوح ہے ویسے فرشتے ہیں

بدن میں رُوح آجاتی ہے جب بے گوری رنگت کے
تو بے انگلش پڑھے روزی بھی مل سکتی ہے نیٹو کو

ایک آزاد نظم

اجسام کے فنون کا کرتے ہیں خود عمل
اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم کو درس
ہوتا ہوں معترض تو وہ کہتے ہیں واہ واہ
میں نے تو کر دیا ترا رتبہ بلند تر
از صحنِ خانہ تا بلبِ بام ازانِ من
از بامِ خانہ تا بہ ثریا ازانِ تو
خود فنِ حرب سیکھ رہے ہیں پریڈ پر
میرے لیے چمن میں شٹل کاک کا ہے کھیل
اظہارِ ناخوشی پہ وہ فرماتے ہیں کہ دیکھ
تیرا ہی مشغلہ ہے بہت صاف و بے ضرر
آں اشترِ ضعیفہ و لکد زن ازانِ من
واں گربہ مصاحب بابا ازانِ تو

جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا
اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا

نادک فگنی سے ظالم کی جنگل میں ہے اک سناٹا سا
مرغانِ خوش الحاں ہو گئے چپ آہو نے اچھلنا چھوڑ دیا

کیوں کبر دعزِ در اس دور پہ ہے کیوں دوست فلک کو سمجھا ہے
گردش سے یہ اپنی باز آیا، یا رنگ بدلنا چھوڑ دیا

بدلی وہ ہوا گذرا وہ سماں، وہ راہ نہیں، وہ لوگ نہیں
تفریح کہاں اور سیر کجا گھر سے بھی نکلنا چھوڑ دیا

وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبرؔ میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

کیا دین کو قوت دیں یہ جواں جب حوصلہ افزا کوئی نہیں
کیا ہوش سنبھالیں یہ لڑکے خود اس نے سنبھلنا چھوڑ دیا

اقبال مساعد جب نہ رہا رکھے یہ قدم جس منزل میں
اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے اُبلنا چھوڑ دیا

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر اُمید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

سامنا اِک نگہِ ناز کا ہے جان کی خیر — مہرباں اک بتِ عیّار ہے ایمان کی خیر
یہ تو زینت ہے کہ پہنے ہیں جڑاؤ بالے — یہ قیامت ہے کہ اللہ مرے کان کی خیر
گوشۂ دامنِ لیلیٰ بھی ہے تر اشکوں سے — ہم بھی کہتے تھے کہ مجنوں کے گریبان کی خیر
ٹھن گئی آج یہی دل میں کہ پہونچوں ان تک — یا مری خیر نہیں یا نہیں دربان کی خیر
ناز سے دامن اٹھاتی تھی جو اپنا لیلیٰ — زیرِ لب کہتی تھی مجنوں کے گریبان کی خیر
آپ کے ناوکِ غمزہ کی توجہ ہو جدھر — موت ہے دل کی منائے جو کوئی جان کی خیر
ادبِ سبحہ و زنّار اُٹھا جاتا ہے — خیر ہندو کی نہ اب ہے نہ مسلمان کی خیر
ترکِ شیراز سے خوشتر ہیں بتانِ مغرب — ظاہرا اب نظر آتی نہیں ایران کی خیر
دل لگی دین کی باتوں میں عیاذاً باللہ — شیخ لاحول پڑھیں تم کہو شیطان کی خیر
اس نے میدان میں سر دے کے کیا قوم کا نام — آپ بنگلے میں منایا ہی کیے جان کی خیر
پارٹی کچھ بھی نہیں جب نہ ہوا ذوقِ طاعت — قوم کی خیر نہیں جب نہیں ایمان کی خیر

اس مسِ برقِ کلیسا کا ہے لکچر اکبرؔ
آج تو علم بھی مانگے کا مسلمان کی خیر

لُطف چاہو اک بتِ نوخیز کو راضی کرو — نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو
لیڈری چاہو تو لفظِ قوم ہے مہماں نواز — گپ نویسوں کو اور اہلِ میز کو راضی کر[illegible]
طاعت دامن دسکوں کا دل کو لیکن ہو جو شوق — صبر پر طبع ہوس انگ[illegible]

زق زق و بق بق میں دنیا کے نہ ہو اکبرؔ شریک
چپ ہی رہنے پر زبانِ تیز کو راضی کرو

طفلِ دل کو الفتِ زلفِ بتاں اک کھیل ہے — خیر ہو ایماں کی یارب کافروں سے میل ہے

مغربی چکر میں تفریحیں بھی ہیں ایذا کے ساتھ
امتیاز اس کا ہے مشکل پارک ہے، یا جیل ہے
برکتیں ساکت، سعادت دم بخود، مذہب خموش
دل دعا سے بے خبر، تدبیر ہی سے میل ہے
کہتے ہیں راہِ ترقی میں ہمارے نوجواں
خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے

وضع بدلی، گھر کو چھوڑا، کاغذوں میں چھپ گئے
چند روزہ کھیل تھا آخر کو سب مر کھپ گئے
مٹ گئے نقش و نگارِ دیرِ فانی کے مرید
نام انہیں کا رہ گیا روشن جو ہر کو جپ گئے
دل کا ٹکڑا تو رہا باقی پے راہ خدا
ریل میں کیا غم جو اکبر کھیت تیرے تپ گئے

آفتِ جاں ہے تجلی آتشِ رخسار کی
خیر ہو یارب نگاہِ شوقِ سہل انگار کی
مست کر دیتی ہے مجھ کو فصلِ گل میں بوئے گل
وجد میں لاتی ہے حالت سبزۂ و اشجار کی
بھینی بھینی ہائے وہ نارنج کے پھولوں کی بو
جس پہ سو جانیں فدا ہوں طبلۂ عطار کی
قطرہ ہائے شبنمِ پاکیزہ پتوں پر نہیں
سبزہ پریوں پر چمک ہے موتیوں کے ہار کی
ہر شگوفے پر تڑپ جاتی ہے طبعِ حسن دوست
پتی پتی پر نگاہیں ڈالتا ہوں پیار کی
ناچتا ہوں صحنِ گلشن میں ہوا کے ساتھ ساتھ
ہم نوائی چاہتا ہوں بلبلِ گلزار کی
مجھ کو دیوانہ بنا دیتا ہے فطرت کا جمال
عارضِ گل سے خبر ملتی ہے روئے یار کی
سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو
حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی
نکہتِ گل ہائے شاخِ گل میں یہ مستی کہاں
اور ہی خوشبو ہے کچھ تیرے گلے کے ہار کی

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار
حکم حاکم سے ہوا تھا اجتماعِ انتشار
آدمی اور جانور اور گھر مزین اور مشین
پھول اور سبزہ چمک اور روشنی ریل اور تار

کیروسین اور برق اور پٹرولیم اور تارپین — موٹر اور ایروپلین اور جگمگھٹے اور اقتدار
مشرقی پتلوں میں تھی خدمت گزاری کی اُمنگ — مغربی شکلوں سے شانِ خود پسندی آشکار
شوکت و اقبال کے مرکز حضورِ امپررلہ — زینت و دولت کی دیوی امپرسٹہ عالی تبار
بحرِ ہستی لے رہا تھا بے دریغ انگڑائیاں — ٹیمز کی امواج جمنا سے ہوئی تھیں ہم کنار
انقلابِ دہر کے رنگین نقشے پیش تھے — تھے پئے اہلِ بصیرت باغِ عبرت میں بہار
ذرّے ویرانوں سے اُٹھے تھے تماشا دیکھنے — چشمِ حیرت بن گئی تھی گردشِ لیل و نہار
مصلحت آمیز ہر طرز و طریقِ انتظام — حکمت آگیں ہر ادائے حاکمانِ نامدار
جامے سے باہر نگاہِ نازِ فتاحانِ ہند — حدِّ قانونی کے اندر آئیزیلوں کی قطار
خرچ کا ٹوٹل دلوں میں چٹکیاں لیتا ہوا — فکرِ ذاتی میں خیالِ قوم غائب فی المزار
دعوتیں، انعام، اسپیچیں، قواعد، فوج، کیمپ — عزتیں، خوشیاں، اُمیدیں، احتیاطیں اعتبار

پیش رو شاہی تھی، پھر ہز ہائی نس پھر اہلِ جاہ
بعد اس کے شیخ صاحب ان کے پیچھے خاکسار

یہ پوچھا شیخ سے میں نے کہ کہیے کیا گزرتی ہے — یہ سُن انیس سو دس ہیں نئے مقصود منظر ہیں
نہایت یاس و حسرت سے وہ بولے کیا کہوں تم سے — یہ دو مصرعے سنو جن میں نہاں دفتر کے دفتر ہیں

نئی تعلیم کے مُردے تو زندہ ہیں تماشوں میں
پُرانی وضع کے زندے مگر مُردوں سے بدتر ہیں

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں — اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں
بھولی، خوش رنگ، چست، نازک پیاری — پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
پھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا اُبھار — تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

لہ empetor
ٹہ empress

جو فاصلہ کرلیا ہے باہم قائم — وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قایم
گوتابعِ جوششِ برق پردازی ہیں — دونوں کے خطوطِ طیر متوازی ہیں
کیوں کر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے — اللہ اللہ کیا ہنرمندی ہے
ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں — فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں
کس بزم میں ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں — پریاں اِندر کی جس سے شرمائی ہیں
اس سمت اگر خیال انساں بڑھ جائے — دامانِ نظر پہ رنگ عرفاں چڑھ جائے

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج — کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو — کہ تیل پیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمّق سے — تمہاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے
خلل نہ شغل میں بدھّو کے ہے نہ جمّو کے — کہ شیخ سدّو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے
عطا ہوئی ہے یہ اسپیکروں کو آزادی — کہ حاکموں میں ہے قال تو یاں اقول بھی ہے
محلِّ صلِّ علیٰ ڈاک و تار کی ہے روش — اگرچہ دل میں نہاں عظمتِ رسول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبلی کی — جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی — کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے
طرح طرح کے بنالو لباس رنگارنگ — علاوہ روئی کے ریشم بھی اور اون[ل] بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن — کہ جس کو دیکھ کے حیران چشمِ غول بھی ہے
شگفتہ پارک ہیں ہر سمت رہروؤں کے لیے — نظر نواز ہے پتی حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

لہ wool

کالج میں ہو چکا جب یہ امتحاں ہمارا — سیکھا زباں نے کہنا ہندوستاں ہمارا
رقبے کو کم سمجھ کر اکبر یہ بول اُٹھے — ہندوستان کیسا سارا جہاں ہمارا
لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم — جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا

مخالفت سے نہ باز آئے گی دنی دنیا — فقط یہ زور سے دبتی ہے یاد رکھ یہ گر
انھیں کی بھینس ہے بھائی کہ جن کی لاٹھی ہے — انھیں کا گاؤں ہے اکبر جو بن سکیں ٹھاکر

طبع کا شغل ہو جو پولٹیکل — تو نہیں ختم وہ فسانہ ہنوز
فتنہ انگیز اختلاف میں ہے — اس کے خرمن کا دانہ دانہ ہنوز
وہی اب تک ہے طاقتوں میں نفاق — وہی اندازِ حاسدانہ ہنوز
وہی سامان خانہ جنگی کے — وہی طرزِ معاندانہ ہنوز
ہے کھلا حرصِ جنگ دنیا میں — نار و آہن کا کارخانہ ہنوز
خود فراموش و خود فروش وہی — وہی سودائے تاجرانہ ہنوز
وہی لیسنس کی طلب گاری — وہی انکار کا بہانہ ہنوز
ہاں جو عرفان کھول دے دردِ دل — ہے نظر میں وہی زمانہ ہنوز
وہی شوق اور وہی اثر موجود — وہی تیر اور وہی نشانہ ہنوز
دلِ حق بیں کو سلطنت کا سرور — وہی تمکینِ عابدانہ ہنوز
چشمِ مشتاق کا عروج وہی — اور وہی جوشِ عارفانہ ہنوز
وہی عہدِ الست پیشِ نظر — مستیٔ بادۂ شبانہ ہنوز

ہست مجلس بداں قرار کہ بود
ہست مطرب بداں ترانہ ہنوز

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظِ طریقت — دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلّق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو — انگریز کو ہے نیٹو سے جس قدر تعلّق

ہر خاک کے پُتلے کو ابھارا ہے فلک نے — یکتائی کے اظہار میں مست اہلِ زمیں ہیں
ہر اک کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم بھی ہیں کوئی چیز — اور ہم کو ہے یہ ناز کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں — باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزّل — گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
سطحِ زمیں سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو — نظروں میں پھُل جھڑی سے گو پھول جھڑ رہے ہیں

طعنے سنتے ہیں مگر شعر کہے جاتے ہیں — داد کے شوق میں بیداد سہے جاتے ہیں
رزولیوشن ہی کے تختے کا سہارا لے کر — بحرِ تدبیرِ ترقی میں بہے جاتے ہیں
ملک الموت نے نوٹس نہ دیا تھا افسوس — اس کمیٹی کے بہت کام رہے جاتے ہیں
آپ فرماتے ہیں ہو لہر ترقی کی تو آ — موجیں کہتی ہیں کہ یہ خود ہی بہے جاتے ہیں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم — اُستاد اچھے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں

اک طرف تمکین ہے اور بے قراری اک طرف — انتظامِ طبعِ انساں ہے خدا کے ہاتھ میں
ہے وہی دیوار میں مٹی بگولے میں جو ہے
نیو کے پنجے میں وہ ہے یہ ہوا کے ہاتھ میں

سب سعی میں مصروف ہیں حاصل کی نہ پوچھو — مغرب کے خضر ساتھ ہیں منزل کی نہ پوچھو
ہے بحرِ مباحث میں رواں کشتیِ اُمید — لہروں کی لچک دیکھو ساحل کی نہ پوچھو

رنگِ زمانہ طرزِ طبائع کا بھی ہے پاس — تقوے کا گو خیال بہت ہے جناب کو
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی — اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

ہر چند کہ ہے مِس کا لونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
سایہ کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن — اُس شوخ کے گھونگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

خوب اِک ناصحِ مشفق نے یہ ارشاد کیا — بزم میں اس نے تعلّی جو کل اکبر کی سُنی
نہ تری فوج، نہ شاگرد نہ پیرو نہ مُرید — نہ تو ارجن ہے نہ سقراط، رشی ہے نہ مُنی
کس نگیں پر ہیں ترے نقش کے آثار عیاں — نوٹ بک تیری شکستہ، تری پنسل ہے گھُنی
فکر سے ذکر سے عبرت سے تجھے کام نہیں — واہ وا کے لیے لفظوں کی دکاں تو نے چُنی
طبع میں تیری وہی خامیِ حرصِ دُنیا — آتشِ خوفِ خدا سے نہ جلی ہے نہ گھُنی
خود پرستی ہے بہت خلق کی خدمت کم ہے — دل دہی کم ہے تو ہے دل شکنی چار گُنی

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بہ گزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

عجب بے تمیزی ہے اِس دَور کی — زمانے کو دیکھ اور شِو شِو پکار
پپیہے سے کہتے ہیں اب پی کو چھوڑ
ضرورت ترقی کی ہے رکیو پکار

یورپ کو پالیسی میں عجلت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

عالم نے یہاں قبول و رد کو جانا
دیکھا دنیا کو نیک و بد کو جانا
عاقل وہ ہے کہ جس نے ہنگامِ عمل
اپنی قوت کو اپنی حد کو جانا

ہر اک سے سُنا نیا فسانہ ہم نے
دیکھا دُنیا میں اک زمانہ ہم نے
اوّل یہ تھا کہ واقفیت پہ تھا ناز
آخر یہ کھلا کہ کچھ نہ جانا ہم نے

دُور کوہِ لبِ ساحل سے جو گذری اِک موج
کوہ نے اِس سے کہا تو نے یہ دیکھا مرا اوج
مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دم چند
بولی۔ سالک کبھی کرتے نہیں ساکن کو پسند
ہیں بڑے آپ مگر اپنی جگہ سے ہیں اٹل
اپنی رفتار میں کیا فائدہ ڈالوں میں خلل
ہنس کے اس بحث پہ بولا کسی جانب سے حباب
پوچھیے موج سے ہے بھی اسے رک جانے کی تاب
اپنے بس ہی میں نہیں ہے، یہ تعلّی کیسی
اضطراری ہے روش شانِ ارادی کیسی
بہہ گئی موج یہ کہہ کر کہ میں مغرور نہیں
تجھ میں اے کوہ مگر روشنیِ طور نہیں
بُلبلا ٹوٹ گیا، کوہ بھی خاموش رہا
وہی حیرت رہی، دریا کا وہی جوش رہا

آزادی کا شور مُبارک
یہ تقلیدی زور مُبارک
میرا تو ہے اور ہی منظر
میں تو یہ کہتا ہوں اکبر
عارف کی بے ہوشی زیبا
عاقل کو خاموشی زیبا

مشرقی کو ہے ذوقِ رُوحانی
مغربی میں ہے میلِ جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولے بوزنا ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق
اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں
بُت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

منشی کہ کلرک یا زمیندار
لازم ہے کلکٹری کا دیدار

ہنگامہ یہ ووٹ کا فقط ہے
مطلوب ہر اک سے دستخط ہے

ہر سمت مچی ہوئی ہے ہل چل
ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل

ٹم ٹم ہو کہ گاڑیاں کہ موٹر
جس پر دیکھو لدے ہیں ووٹر

شاہی وہ ہے یا پیمبری ہے
آخر کیا شے یہ ممبری ہے

نیٹو ہے نمود ہی کا محتاج
کونسل تو ہے ان کی ہی جن کا ہے راج

کہتے جاتے ہیں یا الٰہی
سوشل حالت کی ہے تباہی

ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں
اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں

دراصل نہ دین ہے نہ دنیا
پنجرے میں پھدک رہی ہے مینا

اسکیم کا جھولنا وہ جھولیں
لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا
اچھے اچھے ہیں ووٹ کے شیدا

کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ
اس کو سمجھیں فرضِ کفایہ

بھائی بھائی میں ہاتھا پائی
سلف گورنمنٹ آگے آئی

پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی
ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے؟ فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے؟ فقط سرکاری ہے

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسایے کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

اک غزل میں اتفاقاً میرا اک مصرع یہ تھا
دیدۂ عبرت سے رنگ دیر فانی دیکھیے
کوئی بول اٹھا زوالِ حسن بت مقصود ہے
اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھیے
عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے
بزمِ دنیا میں یہ زورِ بدگمانی دیکھیے

ہر طرف برپا ہے طوفانِ عناد و اختلاف
برہمن اور شیخ سوشل ساز و ساماں کیا کریں
پالسی مغرب پہ مشرق پر تعصب ہے سوار
اس کو ہندو کیا کریں؟ اس کو مسلماں کیا کریں

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

سول سرجن تو ساڑھے سات سے پہلے نہیں اُٹھتے
ولیکن ان کے مرغے کی سحر خیزی نہیں جاتی

گپیں اُڑانے کو اک وادیِ عمل تو ہے
ہمارے واسطے اک ناز کا محل تو ہے
الٰہی رکھ تو سلامت ہمارے لیڈر کو
کہ بزمِ قوم میں اس سے چہل پہل تو ہے
حلا ہی لیں گے کسی کھیت میں بہ حکمِ حضور
خدا کے فضل سے محفوظ اپنا ہل تو ہے

انقلاب آیا، نئی دنیا، نیا ہنگامہ ہے!
شاہ نامہ ہو چکا، اب دورِ گاندھی نامہ ہے!

گاندھی نامہ

تحریکِ ترکِ موالات کے مخالف اور ان کے اعتراضات

میری خودداری کو آخر لے گئے اس میں گھسیٹ
اب ہے میری نوحہ خوانی اور ان کی اسٹریٹ
صبر و یکسوئی و تقویٰ کو کہوں گا میں بجا
یہ تماشائے حقارت آفریں، لیکن بُرا

نادیدنی امور کا تھا اک جگہ رگلہ
سب نے کہا کہ "آپ بھی للّٰہ بولیے"
میں نے کہا کہ "دفع کی طاقت نہیں رہی
منظر اگر برا ہے، تو آنکھیں نہ کھولیے"

چمکا ہے بہت پولٹکل اب اثرِ قوم:
ہے قوم تو بے پر، مگر اُڑتا ہے زرِ قوم.
کیا دین کے سُرمے سے کھُلے چشمِ بصیرت
دنیا ہی کی تحصیل پہ جب ہو نظرِ قوم!

اغراز داثر کی عبث امید ہے تجھ کو! حالت تو یہ ہے پیش، درغیر د سرِ قوم!

ظالم کو گالیاں دیں، ظلم اس کا پایا افزوں بارِ زباں اُتارا، اور بارِ دل بڑھایا!

سازِ گلو چھڑا ہے، ہر سمت اک اُپج ہے! لیکن ذرا سنو تو، عف عف ہے، یا گرج ہے!

نازک بہت ہے وقت، خموشی سے ربط کر! غصّہ ہو، آہ ہو، کہ ہنسی، سب کو ضبط کر!

ہانڈی تو مسلموں کی اب بھی ہے گرم لیکن باقی نہیں مسالا شیخی بگھارنے کو!
وہ زندگی کہاں اب تھی جس میں جیت اپنی! اب ہر طرف ہے خفت، جیتے ہیں ہارنے کو

خاموش بڑائی کرنے والے ہیں کھڑے اس وقت تو وہ بڑا جو صاحب سے لڑے!
کہتے ہیں ہمیں مصیبتوں پر پڑ جائیں! کب تک یہ ڈریں، کہیں مصیبت نہ پڑے!

اور ہی تھی ساخت تیروں کی، نشانا اور تھا! یہ زمانا اور ہے، اور وہ زمانا اور تھا!
تھی نہ یہ لیڈر کی رقاصی، نہ یہ قانونِ غرب سننے والے اور تھے، اس وقت گانا اور تھا!

ہو تیزیِ انور[1] کی جو ہوس، ہنگامہ کرد، توپوں سے بھنو
گاندھی کی جو حکمت خوش آئے، چپ چاپ گزی کے تھان بنو

---

[1] انور پاشا، مشہور و معروف ترک سپہ سالار

صاحب کی رفاقت ہو جو پسند، آسام میں جا کر چائے چُنو
اکبرؔ کی جو مانو، بیٹھ رہو، جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو
اور حمدِ خدا کے گیت سُنو!

مِلؔ[1] سے کہہ دو کہ تجھ میں خامی ہے
زندگی خود ہی اک غلامی ہے!

دل کی طاقت کیا یونہی طاقت کو کھونا چاہیے؟
یعنی بس بکتا پھرے ہر اک: "یہ ہونا چاہیے!"
اہلِ ظاہر کے تماشوں سے تو کچھ ہوتا نہیں
صاحبِ باطن کو تنہائی میں رونا چاہیے

اختلافوں کے مہیا ہیں جب امکاں اتنے
متفق ہو نہیں سکتے کے مسلماں اتنے
حُکم صاحب نے دیا ہے کہ شرارت نہ کرو
خبر اتنی ہی، اور اخبار کے ساماں اتنے!

نہ سمجھے تھے یہ نئی روشنی کے پروانے
یہی ہے قصرِ خلافت کی پھونکنے والی
دعائیں رویئے، اِس وقت یہ مناسب ہے
ہنسا رہی ہے حریفوں کو آپ کی گالی!

چشمِ شاعر میں بہت دلکش ہے گو وہ بھی، مگر
آپ کی آنکھوں کے آگے ذکرِ نرگس کیا کریں!
زورِ بازو جب نہیں ہے، جب نہیں تیغ و تفنگ
سرنگوں خامے سے پھر کاغذ پہ گھس گھس کیا کریں

---

[1] جون سٹوآرٹ مِل، انگریز فلسفی اور سیاست دان، متوفی ۱۸۷۳ء

ٹھونکتے تھے مردِ میداں ہی کی پیٹھ
اب رزولیوشن پہ جے ہونے لگی!

اپنی جگہ ہر اک کا ارماں نکل رہا ہے
تو پیں بھی چل رہی ہیں، جوتا بھی چل رہا ہے!
لیکن رہا میں چُپکا، دل میں یہ بات سوچی
کس تقویت پر اٹھوں؟ انجینیر نہ موچی!

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم
دلوں کو طاعتِ حق سے یہ دور کرتے ہیں!
نہ یہ کہ عیش ہمارا کیا انھوں نے تلخ
ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

دشوار ہے مستحقِ آنر[1] ہونا
کچھ سہل نہیں علی برادر[2] ہونا
ہاں سب یہ دعا کریں کہ ان بندوں کو
آسان ہو پیرو پیمبر ہونا!

تمہاری چال راہِ کفر سے کس دن الگ دیکھی!
جو ظلمِ گرگ ان میں ہے، تو تم میں حرصِ سگ دیکھی!

جس بات کو مفید سمجھتے ہو، خود کرو
اوروں پہ اس کا بار نہ اصرار سے دھرو
حالات مختلف ہیں، زرا سوچ لو یہ بات
دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو!

نہ راجگی کا مجھے شوق ہے، نہ شاہی کا
اگرچہ میں بھی ہوں طالب مگر خدا ہی کا!
یہ دعظِ مغرب، اور اس کا اثر یہ ملّت پر
بنا ہے شوقِ ترقی سبب تباہی کا!

---

[1] honour

[2] یعنی مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی شوکت علی۔

دید کے قابل اب اُس اُلّو کا فخر و ناز ہے   جس سے مغرب نے کہا "تو آنریری باز ہے!"

رفیقِ شیطاں چمک گئے ہیں، معینِ آدم دبک گئے ہیں
سنائیں کیا تم کو قولِ فیصل، کہ غور کر کر کے تھک گئے ہیں
ہمارا چلنا وہ رینگنا ہے جو کچھوے بھی ہنسیں بجا ہے
مگر زباں پر وہ زمزمے ہیں کہ سُن کے بلبل پھڑک گئے ہیں

بے سود آج تذکرۂ عدل و جَور ہے   اپنا بھی ایک وقت تھا اُن کا بھی دَور ہے!

ہے چھتّری بھی چپ، نہ پٹا ہے نہ بانک ہے
پوری بھی خشک لب ہے کہ گھی چھہ چھٹانک ہے!
گو ہر طرف ہیں کھیت پھلوں سے بھرے ہوئے
تھالی میں خربزے کی فقط ایک پھانک ہے!
کپڑا گراں ہے، ستر ہے عورت کا آشکار
کچھ بس نہیں زباں پہ فقط ڈھانک ڈھانک ہے!
بھگوان کا کرم ہو سودیشی کے بیل پر
لیڈر کی کھینچ کھانچ ہے، گاندھی کی ہانک ہے!
اکبر پہ بار ہے یہ تماشائے دل شکن
اس کی تو آخرت کی طرف تاک جھانک ہے!

دنیا تو اسی گھر کی کنیز آج ہے اکبر   صاحب سے ہو بیزار تو دنیا کو بھی چھوڑو!

عزیزوں کو سزائے قید سے رنج وضرر پہنچا　　حریفوں پر زرا سوچو کہ اس کا کیا اثر پہنچا!

ذہن میں آیا یہ مضمونِ تفکر آفریں　　جب حقیقت پر نظر کی، وہم کو کم کردیا
دَیر کو شکرِ کلیسا چاہیئے کرنا ادا　　سامنے بت کے اُسی نے شیخ کو خم کردیا

مہاتما جی سے مل کے دیکھو، طریق کیا ہے، سبھاؤ کیا ہے!
پڑی ہے چکر میں عقل سب کی، بگاڑ تو ہے، بناؤ کیا ہے؟

یہی گاندھی سے کہہ کر ہم تو بھاگے　　"قدم جمتے نہیں صاحب کے آگے"
وہ بھاگے حضرتِ گاندھی سے کہہ کے　　"نگر سے بیر کیوں، دریا میں رہ کے؟"

ہمارے ملک میں سرسبز اقبالِ فرنگی ہے　　کہ نن کوآپریشن[1] میں بھی شاخِ خانہ جنگی ہے!

جو پوچھا میں نے کیسی شب تھی کل، کیا حال تیرا تھا؟
ترے گھر میں نہیں تھی روشنی، بالکل اندھیرا تھا!
وہ بولا، شوخیِ پروانہ سے میں تنگ آیا تھا
مرے دل میں پتنگوں سے خیالِ جنگ آیا تھا
اُچھلنے کودنے کا شوق تھا پروانے کے سر میں
کیا ترکِ تعاون، روشنی کی ہی نہیں گھر میں

---

[1] عدم تعاون non-cooperation

کہا میں نے کہ پروانوں کو جو کچھ بھی ضرر پہنچا!
بتا مجھ کو کہ تاریکی کا تجھ پر کیا اثر پہنچا؟
لگا کہنے اندھیرے میں تو ٹھوکر میں بھی کھاتا تھا
مگر اُڑنے کے بدلے رینگنا اُن کا خوش آتا تھا!

اس سوچ میں ہمارے ناصح ٹہل رہے ہیں
گاندھی تو وجد میں ہیں، یہ کیوں اُچھل رہے ہیں
نشو و نمائے کونسل جن کو نہیں میسّر
پبلک کی جے میں ان کے مضمون پل رہے ہیں
ہیں وفد اور اپیلیں، فریاد اور دلیلیں
اور کبرِ مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں
یہ سارے کارخانے اللہ کے ہیں اکبرؔ!
کیا جائے دم زدن ہے، یوں ہی یہ چل رہے ہیں

کہا بلبل نے "کیوں رہوں خاموش؟ پھر کہاں یہ زمانہ پاؤں گی؟
ذبح ہونے کی کوئی بات نہیں
رہا پھنسنا، تو دانہ پاؤں گی!"

اگرچہ شیخ و برہمن اُن کے خلاف اس وقت اُبل رہے ہیں
نگاہِ تحقیق سے جو دیکھو، انھیں کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں

شوخیِ غرب سے گھبرائی جو شرقی رندی
بت نے انگڑائیاں لیں، دیر میں چونکی بندی!
لب پہ آیا یہ سخن: کیسی اٹھی ہے آندھی!
لہجۂ صبر و متانت میں یہ بولے گاندھی
ذہنِ عالی سے تراشنے لگے قانون نئے
عاجزی ہم کو سُجھانے لگی مضمون نئے

ہم تاجر ہوں، تم نوکر ہو، اس بات پہ سب کی عقل ہے گُم!
انگریز کی تو خواہش ہے یہی، بازار میں ہم، دربار میں تُم!

جو شامِ فتنہ افق پر جہاں میں طاری ہے
وہ سلسلہ ابھی قائم ہے، اور جاری ہے
نتیجہ اس کا عیاں ہوگا چند روز کے بعد
ظہورِ سازبھی ہوگا وفورِ سوز کے بعد
خدا کی یاد سے پر نور جن کا ہے سینا،
سمجھ رہے ہیں کہ فطرت نہیں ہے نابینا

مسلم کا میاں پن سوخت کرو، ہندو کی بھی ٹھکرائی نہ رہے!
بن جاؤ ہر اک کے باپ یہاں، دعوے کو کوئی بھائی نہ رہے!
ہم آپ کے فن کے گاہک ہوں، خدام ہمارے ہوں غائب
سب کام مشینوں ہی سے چلے، دھوبی نہ رہے نائی نہ رہے!

سن لو یہ بھید، ملک جو گاندھی کے ساتھ ہے
تم کیا ہو؟ صرف پیٹ ہو، وہ کیا ہے؟ ہاتھ ہے!

نہ مولانا میں لغزش ہے، نہ سازش کی ہے گاندھی نے
چلایا ایک رُخ اُن کو فقط مغرب کی آندھی نے

مغربی تعلیم سے دل ایشیا کا ہے ملول　　کر دیا خلقت کو اس نے بے تمیز و بے اصول
جو کرے اصلاح اس کی، مدح کا ہے مستحق　　اور باتوں کو بہ ظاہر میں سمجھتا ہوں فضول

لشکرِ گاندھی کو ہتھیاروں کی کچھ حاجت نہیں　　ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہیے

نئی روشنی کا ہوا تیل کم　　حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے　　نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے　　سیاسی کمیٹی میں پل جائیے
اسی میل کا آج کل ہے ظہور　　خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

کیوں دلِ گاندھی سے صاحب کا ادب جاتا رہا
بولے: کیوں صاحب کے دل سے خوفِ رب جاتا رہا

اک شیخِ حق اندیش سے یہ شعر سنا کل
جب چھاؤنی میں توپ دغی صبح کو تڑکے

صاحب سے رہے مِل کے، وہی خوب ہے نیٹو
گھوڑا وہی اچھا ہے جو موٹر سے نہ بھڑکے!

یہی مرضی خدا کی تھی ہم اُن کے چارج[1] میں آئے
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ جارج[2] میں آئے

---

[1] charge　　[2] George

کوچۂ سروسِ انگلش میں رہے ہم ساکن
جاہ و زرہی کی تمنا میں کٹے زلیست کے دن
وعظِ گاندھی سے بدل سکتے ہیں کیوں کر باطن
"عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں، مومن!
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے!"

بس آپ ہی کیجیے اچھل کود
ہم سے یہ امید اب ہے بے سود
تیزاب میں ہم تو گل چکے ہیں
ان کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں

جھکا ہوا ہوں میں سوئے مشرق اُدھر وہ مغرب میں تن رہا ہے
مرا فسانہ ہوا پُرانا، اب اس کا افسانہ بن رہا ہے!
نہیں ہے اب دُور وقت آخر، حضوریِ حق میں رہ تو حاضر
اِن انقلابوں سے ہو نہ بے دل، یہی فلک کا چلن رہا ہے!

مل نہ سکتی ممبری تو جیل میں بھی جھیلتا
بے سکت ہوں، ورنہ کوئی کھیل میں بھی کھیلتا

نہ گاندھی کی رفاقت ہے، نہ صاحب سے توسل ہے
فلک کو دیکھتا ہوں، بس خدا ہی پر توکل ہے
جو عاقل ہے وہ موقع کے مطابق کام کرتا ہے
ہوا میں ہے تو شاہیں ہے، قفس میں ہے تو بلبل ہے

ہزاروں ہی طریقوں سے ہم انگریزوں کو گھیرے ہیں
طواف اُن کے گھروں کا ہے، اُنھیں سڑکوں کے پھیرے ہیں

سواری ہے اُنھیں کی، راہ اُن کی اور ڈاک اُن کی
اُنھیں کی فوج ہے، اُن کی پُلیس[1] ہے اور تاب اُن کی!

ہوا ہیں ایرشپ[2] اُن کے، سمندر میں جہاز اُن کے
عمل ہم میں کیا کرتے ہیں نا معلوم راز اُن کے!

علوم اُن کے، زباں ان کی، پریس[3] اُن کے، لُغات اُن کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات اُن کے!

بہت ایسے ہیں جو ترکِ تعاون کے بھی قائل ہیں
مگر اونچے جو ہیں، اکثر طرف انگلش کے مائل ہیں

فقط ضد ہے جو کہتی ہے کہ "جب اپنی زباں کھولو
ہمارے پیشوائے ملک، گاندھی جی، کی جے بولو"

قرائن کہہ رہے ہیں، آرہا ہے دور فتنوں کا
ہوائیں وہ چلیں گی، نقش مٹ جائے گا کتنوں کا!

کسی کی چل سکے گی کیا، اگر قربِ قیامت ہے
مگر اِس وقت اِدھر چرخا، اُدھر ان کی وزارت ہے

بھائی مسلم رنگِ گردوں دیکھ کر جاگے تو ہیں
خیر ہو قبلے کی، لندن کی طرف بھاگے تو ہیں!

---

[1] police [2] air ship [3] press

کہتے ہیں بت: "دیکھیں کیسا رہتا ہے ان کا سبھاؤ"
"ہار کر سب سے میاں ہمرے گلے لاگے تو ہیں!"

مذہب واپس، خیالِ جنت واپس — مسجد کا وہ حق، وہ نذر و دعوت واپس
حضرت نے یہ صاف کہہ دیا سب سے کہ "میں — کرنے کا نہیں خطاب و خلعت واپس!"

مشتبہ تیری دعا کا اثر اے اکبر ہے!
رزولیوشن کے پٹاخے سے مگر بہتر ہے!

کہا گاندھی سے کہ "موزوں نہیں یہ آپ کا کام"
ہنس کے بولے کہ "مقفیٰ ہے صریحاً یہ نظام"
آپ کا زور تو جنگی نئے آلات میں ہے
قافیہ اس کا فقط "ترک موالات" میں ہے

پوچھتا ہوں "آپ گاندھی کو پکڑتے کیوں نہیں؟"
کہتے ہیں "آپس ہی میں تم لوگ لڑتے کیوں نہیں؟"
"پیچ قسمت کے تمہارے جب دکھائیں کے کجی،
عادلانہ رنگ میں اُٹھ کر کریں گے ہم ججی!"

اب جو صاحب لوگ مرتے ہیں، تو کہتے ہیں یہ بات
"عاقبت جو کچھ بھی ہو، صاحب سے تو پیچھا چھٹا!"

گاندھی تو ہمارا بھولا ہے، اور شیخ نے بدلا چولا ہے
دیکھو تو خدا کیا کرتا ہے، صاحب نے بھی دفتر کھولا ہے
آ زر کی پہیلی بوجھی ہے، ہر اک کو تعلّی سوجھی ہے
جو چوکر تھا وہ سوجی ہے، جو ماشا تھا وہ تولا ہے
یاروں میں رقم اب کٹتی ہے، اس وقت حکومت بٹتی ہے
کمپو سے تو ظلمت ہٹتی ہے، بے نور محلّہ ٹولا ہے

مے فروشی کو تو روکوں گا، میں باغی ہی سہی
سرخ پانی سے ہے بہتر مجھے کالا پانی!

بتِ خود بیں نے نیت کی ہے مجھ سے بے وفائی کی
ترنگ آئی ہے اس کے دل میں بھی گاندھی ادائی کی

کیا طلب جو سواراج بھائی گاندھی نے
مچی یہ دھوم کہ ایسے خیال کی کیا بات!
کمالِ پیار سے انگریز نے کہا اُن سے!
ہمیں تمھارے ہیں، پھر ملک و مال کی کیا بات

حکّام سے نیاز، نہ گاندھی سے ربط ہے
اکبرؔ کو صرف نظمِ مضامیں کا خبط ہے!
ہنستا نہیں وہ دیکھ کے اس کو دبھاند کو
دل میں تو قہقہے ہیں، مگر لب پہ ضبط ہے

پتلون کے بٹن سے دھوتی کا پیچ اچھا
دونوں سے وہ جو سمجھے دنیا کو ہیچ اچھا

مغربی مقصود حاصل بے تردّد ہوگیا
ہند نے اتنی ترقی کی کہ بے خود ہوگیا

قوم سے دوری سہی حاصل جب آنر[1] ہوگیا
تن کی کیا پروا رہی جب آدمی سر[2] ہوگیا

مراد بھی ملی ہمدرد بھی ہوے مشہور
شریکِ ماتمِ اکبر ہوئے یہ خوب کیا

زبانیں خوب کھلتی ہیں مگر قسمت نہیں کھلتی
سبب یہ ہے کہ اُٹھتا ہے قلم، ہاتھ اُٹھ نہیں سکتا

کیوں کر کہوں کہ کچھ بھی نہیں فَیر[3] کے سوا
کعبے میں بو کی بحث، کلیسا میں رنگ کی
دریا میں کیوں رہو کہ مگر سے ہو سابقہ
سب کچھ فنونِ غرب میں ہے خیر کے سوا
اب شیخ ہند جائیں کدھر دَیر کے سوا
لیکن رہو تو چارہ ہی کیا بیر کے سوا

جینے میں انھیں کو تھی عزت کہ جنھیں ہم نے
اس عہد میں اے اکبر ہم اس کو ولی سمجھے
شمشیر بہ کف پایا، خنجر بہ کمر دیکھا
تھوڑا سا بھی جس دل میں اللہ کا ڈر دیکھا

چور کے بھائی گرہ کٹ تو سُنا کرتے تھے
اب یہ سنتے ہیں اڈیٹر کے برادر لیڈر

۱؎ honour ۲؎ sir ۳؎ fire

غرض اس سے نہیں مجھ کو، بنی ہے یہ زمین کیونکر
یہ فرمائیں میسر آئے گی، نانِ جویں کیونکر
یہی پرسش ہے ہر سو آپ بی۔ اے ہیں کہ ایم۔ اے ہیں
یہ ہے جب رنگ دنیا کا تو سیکھیں علمِ دیں کیونکر

بحث رہتی ہے یہی، ہم کیا کریں؟ میں یہ کہتا ہوں کہ پہلے ہم بنیں

عہدہ دیتے ہیں، سند دیتے، زر دیتے ہیں
خان ساماں وہ مجاہد کو بھی کر دیتے ہیں

الگ ہے شخصیتِ حوادث، ہمیں بے یادہ اُبھر رہے ہیں
یہ وقت ہم پر گزر رہا ہے کہ وقت پر ہم گزر رہے ہیں

افلاک ایرشپ پہ، زمیں سرپہ گاؤ کے افسوس شیخ جی کا ٹھکانا کہیں نہیں!

دونوں کے سُر ملیں یہ قریباً محال ہے انجن رہے جہان میں یا شیخ جی رہیں!

حضرت اکبر نہیں معلوم ہیں کس سوچ میں زندگی سے ہو لیے رخصت مگر مرتے نہیں

سینگ غائب ہے تو پھر گردن اُٹھانا ہے فضول
حضرتِ اشتر سے کہہ دو، یا لدیں یا ذبح ہوں!

نہیں ہرگز مناسب پیش بینی دورِ گاندھی میں
جو چلتا ہے وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے آندھی میں

جب قوت تھی، سب دعوے تھے، قوت ہوئی گم، اب کچھ بھی نہیں
طاقت ہی کے سارے غمزے تھے کمزور کا مذہب کچھ بھی نہیں

اُن سے دل ملنے کی اکبرؔ کوئی صورت ہی نہیں
عقلمندوں کو محبت کی ضرورت ہی نہیں

اس کے سوا اب کیا کہوں، مجھ کو کسی سے کد نہیں
کہنا جو تھا وہ کہہ چکا، بکنے کی کوئی حد نہیں

کہہ دو مرغانِ چمن سے کہ ہوا در ہے اب
زمزمے جن کو خوش آئیں یہ وہ صیاد نہیں

یہ فریب و زور کی ہے روش کہ خزاں پہ ہوتی ہے وارنش
وہ بہارِ لالہ و گل کہاں، وہ چمن کہاں، وہ صبا کہاں
ہوئی ہے پرانی یہ داستاں اور اٹھا ہے اب یہ نے فغاں
نہیں اکبرؔ اپنے حواس میں، کوئی اس سے پوچھے یہ تھا کہاں

نہ صاحب کو مارو۔ نہ صاحب سے بھاگو
مچاتے رہو غل، پٹو اور مانگو

باطن کا جمال آئے بھی نظر اور رازِ دروں ظاہر بھی نہ ہو
آسان نہیں ہے اے اکبرؔ، عاشق بھی بنے، کافر بھی نہ ہو

شعر کہتا ہے بزم سے نہ ٹلو
داد لو، واہ کی ہوا میں پلو
وقت کہتا ہے قافیہ ہے تنگ
چُپ رہو، بھاگ جاؤ، سانس نہ لو

مجھے بھی دیجیے اخبار کا ورق کوئی
مگر وہ جس میں دواؤں کا اشتہار نہ ہو
جو ہیں شمار میں کوڑی کے تین ہیں اس وقت
یہی ہے خوب، کسی میں مرا شمار نہ ہو
گلہ یہ جبر کا کیوں کر رہے ہو اے اکبرؔ
سکوت ہی ہے مناسب جب اختیار نہ ہو

حکام ہیں خزانہ و توپ و رفلؔ کے ساتھ
خدّام ہیں شگوفۂ ترکِ عمل کے ساتھ
بازو میں یاں نہ زور، گلے کو نہ شوقِ شور
ہم تو مشاعرے میں ہیں اپنی غزل کے ساتھ

دیاسلائی کی تیزی تو آگئی ہم میں
کسر یہی ہے کہ ڈبیا انھیں کی جیب میں ہے

سُنا ہر اک نے زبان و قلم پہ کیا گزری
مگر خدا ہی نے جانا کہ ہم پہ کیا گزری

خدا کے باب میں کیا آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں
خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں
مگر اس شعر کو میں غالباً قائم نہ رکھوں گا
مچے گا غل، خدا کو آپ کیوں بدنام کرتے ہیں

خدمت بہت اہم ہے گروہِ پولیس کی
پروا کرد کچھ اُن کے الاؤنس وفیس کی
رہتے یہی ہیں سینہ سپر انتظام میں
ڈر بدمعاش کا نہ مروّت رئیس کی
بلوؤں کی ضرب انھیں پہ پڑا کرتی ہے بہت
موجیں انھیں پہ آتی ہیں گاندھی کی ٹیس کی
فیاضیوں سے لیجیے کام ان کے باب میں
رد کیجیے دلیل مشیرِ خسیس کی
ہوں سیکڑوں حساب میں تب کام کچھ چلے
اس وقت کیا بساط ہے پچیس تیس کی

حکومت اور دولت کی جو دے چاٹ
تو بن جائیں گے آخر یہ ترے بھاٹ
عداوت مذہبی جو ہے پرانی
اُبھار اس کو بہ اندازِ نہانی
مجھے معلوم ہیں نیٹو[1] خصائل
کہاں یہ وحدتِ ملکی پہ مائل
کوئی دادا کو اپنے رٹ رہا ہے
کوئی اِک جانور پر کٹ رہا ہے
زباں ہی پر کوئی دیتا ہے یاں جاں
معانی ہوتے ہیں لفظوں پہ قرباں
حقیقت میں یہ سب ہیں شرک آلود
اسی سے تو ہے اُن کے سر پہ موجود
کوئی ان میں سے ایسا خود غرض ہے
کہ قومی بحث کو سمجھا مرض ہے
غرض ذاتی تو اس کی کر دے پوری
تو ہے منظور اس کو سب سے دوری
تو وہ بیدار اور مصروف جسٹس[2]
سمجھ لے بے اثر نیٹو کی گھس گھس

غزل

ایں چہ شورست کہ در بحثِ بجٹ می بینم
ہر طرف بینشِ محصول ڈکٹ می بینم
بر حکومت اثرے نیست ز قانونِ الہٰ
ہمتِ او ہمہ مصروفِ گزٹ می بینم

---

[1] native
[2] justice

ممبراں راکہ از انعام جو افتاد بدست
شائق و منتظرِ بھوجن وچیٹ[1] می بینم

جبرے پردہ کشا داست در مکروفریب
در اخلاص بہر ناصیہ شٹ[1] می بینم

جو ہیں مالوی[2] اور شوکت[3] میاں
لگے کرنے آپس میں سرگوشیاں

جدا جب ہوئے اور ملے بزم میں
تو پایا گیا یہ دلی عزم میں

وہ بولے کہ "کابل سے ہوگا گزند
کریں گے ہم انگریز ہی کو پسند"

یہ بولے کہ "ہندو کا ہوگا جو رول
ہم انگریز ہی کو کریں گے قبول"

نہ تھا اُن کے آپس میں کچھ اس سے رنج
یہ پڑھنے لگے ہو کے وہ نغمہ سنج

"کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا"

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت
کالج سے امام ابوحنیفہ رخصت

صاحب سے سُنی ہے اب قیامت کی خبر
قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

آہ کو یہ گلہ ہے گردوں سے
موقع سلطنت نہیں ملتا

میں پریشاں اسی سبب سے ہوں
گوشۂ عافیت نہیں ملتا

دامِ دنیا کے خضر ہیں لاکھوں
رہبر عاقبت نہیں ملتا

لالہ صاحب یہاں بہت ہیں مگر
ثانیٔ لاجپت[4] نہیں ملتا

---

[1] shut
[2] پنڈت مدن موہن مالوی
[3] مولانا شوکت علی
[4] لالہ لاجپت رائے

یہ ہے کلام کی خوبی کہ بات ٹھیک کہو
مگر میں سچ سے اب اندیشہ ناک رہتا ہوں
زمانہ اب نہیں حضرت یہ خوب کہنے کا
اسی سبب سے میں چپ ہوں کہ خوب کہتا ہوں

آپ کیوں اپنا خطاب اے خان واپس کیجیے
خود اُنھیں سے کہیے میری شان واپس کیجیے
واپسی آخر کی جھگڑا ختم کر سکتی نہیں
لوگ کہتے ہیں، خدا کو جان واپس کیجیے
یہ تواضع کیا، برآمد خود نہیں ہوتے جو وہ
چھوڑیے ڈیوڑھی کو حقّہ پان واپس کیجیے
آپ جس کو نزع سمجھتے تھے غشی تھی وہ فقط
لائیے کرتا، کفن کا تھان واپس کیجیے
مدح کا بے انتہا ممنون ہوں، لیکن جناب
دام اگر دینے نہ ہوں دیوان واپس کیجیے

دُعائے کلّو

اے خدا مجھ کو کر دے صاحب لوگ
دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قالبِ غربی
بھول جاؤں زبان بھی اپنی
رنگ چہرے کا میرے جائے بدل
کروں ایجاد میں بھی توپ و رفل
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں
سب یہ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

دنیا سے تعلق جن کا ہے، وہ خوش نہ سہی مشغول تو ہیں
پژمردہ جو ہیں بھی سرتاپا، شاخوں میں لگے ہیں پھول تو ہیں
آفت تو ہماری جان پہ ہے، دنیا کا تعلق چھوٹ گیا
بس طوقِ گلو ہے رشتۂ جاں، اُمید کا رشتہ ٹوٹ گیا

دلِ شکستہ میں اک سازِ جاں نواز بھی ہے
لرز رہا ہوں میں جس سے اُسی پہ ناز بھی ہے

ہمیں بھگوان کی کرپا نے تو بابو بنایا ہے
مگر یورپ کے شالالوگ، نے اُلّو بنایا ہے

لاکھ سمجھاتا ہوں اس کو میز پر آ، چاے پی
یہ عروسِ ہند اب تک کہہ رہی ہے "ہاے پی"

کیوں کوئی آج ہر کا نام جپے
کیوں ریاضت کا جیٹھ سر پہ تپے
کام وہ ہے جو ہو گورنمنٹی
نام وہ ہے جو پانیئر میں چھپے

شبِ وصال میں گاندھی کا وعظ آفت ہے
یہ حکم ہے کہ نہ بڑھیے مساس کی حد سے
ہر اک کی رگ میں نہیں ہے سکونِ رُوحانی
یہ ضبط سہل نہیں جذبۂ مجرّد سے
نگاہ دور ہی رکھو، خیال کافی ہے
بجز فساد کے حاصل نہیں کچھ اس کد سے

بہار آئی ہے گلگوں کے فوارے ہوئے جاری
یہاں ساون سے بڑھ کر ساقیا پھاگن برستا ہے
فراوانی ہوئی دولت کی صناعانِ یورپ میں
یہ ابرِ دورِ انجن ہے کہ جس سے ہُن برستا ہے

آبِ زمزم سے کہا میں نے ملا گنگا سے کیوں
کیوں تری طینت میں اتنی ناتوانی آ گئی ؟
وہ لگا کہنے کہ حضرت! آپ دیکھیں تو ذرا
بند تھا شیشی میں، اب مجھ میں روانی آ گئی

برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ
روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

مذہب کی پرکھ مسجد و مندر میں نہیں ہے
بازار میں، دربار میں دیکھو ان کے عمل کو
کم اچھے ہیں، اکثر وہ ہیں، دیکھے اگر اُن کو
روباہ فراموش کرے اپنے دغل کو

ایک خط

عشرت حسین کے نام

سیّد عشرت حسین پیارے — خالق تمہیں ہر طرح سنوارے
اے جانِ پدر! مری دعا لو — آنکھوں سے یہ خط مرا لگا لو
اظہارِ ادب ہے، حسنِ فرزند — خالق رکھے گا تم کو خورسند
تحریر تمہاری میں نے پائی — صدمہ بھی ہوا، ہنسی بھی آئی
صدمے کا سبب فراقِ عشرت — ہنسنے کا سبب مذاقِ عشرت
عشرت منزل میں نور تم سے — سب کے دل میں سرور تم سے
یا دھن تھی کہ میں یہیں رہوں گا — یا دُھن ہے، یہاں نہیں رہوں گا
گو طبع کا انتشار ہے یہ — بچپن کی مگر بہار ہے یہ
طفلی ہے تمہاری تم کو کافی — لغزش ہے یہ قابلِ معافی
بے شک تم اداس ہو گے گھر پر — مفقود ہے واں یہاں کا منظر
سبزہ کہاں اور کہاں یہ جنگل — کہسار کہاں، کہاں یہ بادل
یاں آہو و دشت و بلبل و باغ — واں کوشک و موش و بطخ و زاغ
یہ سیر و شکار واں کہاں ہے — جھانسی کی بہار واں کہاں ہے
ہے اس کے علاوہ اک خیال اور — بے شک ہے وہ بات قابلِ غور
ہنگامۂ شہر، آرزو خیز — بچوں کے لیے ہے فتنہ انگیز
کہتا ہوں میں صاف صاف تم سے — کرتا نہیں اختلاف تم سے
بہتر ہے یہی، رہو مرے پاس — تہذیب کی آئے تم میں بو باس

انگریزی سوسائٹی کو دیکھو — 'مینر'[۵۱]، کو 'ورائٹی'[۵۲]، کو دیکھو
کھیلو جنگل میں گوئے و چوگاں — طاقت صحت کی ہو نگہبان
محنت ہی کا ہے جہان میں شور — ہے جسم قوی تو دل میں ہے زور
گھوڑے کی بھی سیکھ لو سواری — ہے شرم رہو جو اس سے عاری
گو دل پہ تمہارے ہوگا یہ جبر — لیکن چندے ابھی کرو صبر
جم کر جو کہیں قیام ہو جائے — یکجائی کا انتظام ہو جائے
کلکتے سے آگئی ہے بندوق — رکھا ہے بجنسہ وہ صندوق
محصول اور کارتوس اور کاٹھ — دینے پڑے دام تین کم ساٹھ
انشا اللہ یاں جب آنا — جنگل میں نشانہ آزمانا

گھبرایا ہوں بسکہ طولِ خط سے
طالب ہوں مدد کا میں 'فقط' سے

---

۵۱ manner

۵۲ variety

